ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی

کشمیری لال ذاکر

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی
کشمیری لال ذاکر

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی

کشمیری لال ذاکر

ناولستان - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵



تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار: دسمبر ۱۹۹۱ء　　تعداد: 750　　قیمت: =/48

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

بھوپال گیس ٹریجڈی سے متاثر

اُن معصُوم بچّوں کے نام

جِن میں گُڈُو بھی شامل ہے۔

محاذ ایک ہی ہے

میرے دُوسرے ناولوں کی طرح، یہ ناول بھی اِنسانی رِشتوں کے بننے، اُستوار ہونے اور پھر ٹوٹ جانے ہی کی داستان ہے۔

ہمارا سماج میل ڈومی نیٹڈ سماج ہے۔ تعلیم اور سماجی بیداری کے باوجود بہت سے لوگ۔ ذہنی طور پر، ابھی سولھویں صدی ہی میں جی رہے ہیں۔ اُن کے سوچنے کا انداز بھی اُسی صدی کا ہے۔ اُس میں کہیں کوئی واضح تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔ ورنہ بیاہی ہوئی جوان عورتوں کا کم جہیز لانے کے سبب خودکشی کرنا، اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ مجبوراً ستی ہونا اور گربھ کی حالت میں بچے کا سیکس جاننے کے لیے امینوسینٹِسس ٹیسٹ کرانا اور اگر لڑکی ہو تو اسقاطِ حمل کرا دینا — یہ اِس صدی کی باتیں کہاں ہیں، جو کچھ ہی برسوں میں ختم ہونے والی ہے؟ اِنسانی معاشرہ تو کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔ لیکن تھرڈ ورلڈ کنٹریز کا سماجی ڈھانچہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ اُوپر کی لیپا پوتی ضرور ہُوئی ہے کہیں کہیں۔ مگر بُنیادی سٹرکچر ویسے کا ویسا ہی ہے اور وہ اس قدر مضبوط ہے کہ بڑے بڑے زلزلے بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔

میرا یہ ناول بھی انسانی رشتوں ہی کی داستان ہے۔ کردار چاہتے ہیں کہ وہ زندگی کو اپنی مرضی سے جئیں اور اپنے فیصلے خود کریں۔ کسی دوسرے شخص کو اُن کے فیصلوں پر نظرِثانی کرنے کا حق نہ ہو۔ لیکن ہوتا اس کے عین برعکس ہے۔ کردار کرنا تو کچھ اور چاہتے ہیں لیکن کرنا انہیں کچھ اور پڑتا ہے۔ فرد پر سماجی اور جذباتی دباؤ اِس شدّت سے ڈالا جاتا ہے کہ وہ ایکدم ٹُوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ ہماری زندگیوں میں پرمپرائیں، تقدیر اور ستارے اور گرہ بڑا ہی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ جب ہم ایک کڑے سنگھرش کے باوجود ہار جاتے ہیں تو تقدیر

اور ست۔۔ وں کو ذمہ دار ٹھہرا کر، اپنی اور دُوسروں کی تسلی کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن رُوح میں ارنج اور کرب کا جو نشتر ہر لمحہ چُبھتا رہتا ہے، اُس کا درد کم نہیں ہوتا۔ وقت کا بھی اثر نہیں ہوتا اُس پر۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے جنگ کرتے ہُوئے جب تھک جاتے ہیں اور دِل و دماغ کی قوت سلب ہونے لگتی ہے تو ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ وقت کے بہاؤ نے ہمارے درد اور کرب کو کم کر دیا ہے۔

ہمیں زندگی بھر بڑی متضاد قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ہم اپنی فہم و فراست کے مطابق، اپنے لشکر کے ہر سپاہی کو کیل کانٹے سے لیس کر کے، جنگ کے میدان میں دھکیل دیتے ہیں۔ لیکن دشمن کی فوج ہمارے سپاہیوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور ہمارا ایک ایک سپاہی بے جگری سے لڑنے کے باوجود ہارتا جاتا ہے اور اپنے محاذ سے ہٹتا جاتا ہے۔ لیکن کوئی ایک ایسا سپاہی پھر بھی رہ جاتا ہے جو مرتے دم تک مقابلہ کرتا ہے اور ہار نہیں مانتا۔ سرجُو شرما ایک ایسا ہی سپاہی ہے۔

میں نے اس ناول میں جنگ کا جو نقشہ تیار کیا ہے، وہ بھی مختلف قسم کا ہے۔ ناول میں چیپٹرز نہیں ہیں۔ ناول پانچ حصّوں میں منقسم ہے۔ ہر حصّہ ایک فوجی ٹکڑی ہے، جس کا جرنیل عنوان کے رُوپ میں ٹکڑی کے سب سے اُوپر کھڑا ہے اور وہی اس کا سپہ سالار بھی ہے اور سپاہی بھی۔ ہر جرنیل پُوری ہمّت، بھرپُور اعتماد اور بڑی دلیری سے لڑتا ہے اور جب دُشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو فوج کی کمان دوسرے جرنیل کو سونپ دیتا ہے اور خود ایک اُونچی پہاڑی پر کھڑا ہو جاتا ہے اور سپاہیوں کو بہادری سے لڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔

یہ جنگ تو دراصل سماجی استحصال، ایکسپلائے ٹیشن، ناانصافی، احتیاج اور منفی قوتوں کے خلاف ہے۔ اور ایک طرح سے یہ انفرادی جنگ ہے۔ ہر فرد اپنی لڑائی اکیلے ہی لڑ رہا ہے کہ ہر شخص کو آخر اپنی لڑائی خود ہی لڑنی پڑتی ہے۔ ہم جن جنگوں میں شامل ہیں وہ سب اکیلے لڑی جانے والی جنگیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ ایک ہی بڑی جنگ ہے لیکن لڑی وہ الگ الگ طور سے اور الگ الگ محاذوں پر

جا رہی ہے۔

آنند، سرجو، سادھنا، دیپک شرما، گور بخش، ورما، گڈو اور ناول کے چھوٹے پاتر، سبھی ایک ہی جنگ میں مصروف ہیں۔ اور آخری لڑائی کا میدان وہ کورو کشیتر ہے، جہاں ایک بھیانک اور جان لیوا زہریلی گیس کے اچانک حملے سے بچنے اور اپنی جان بچانے کے لیے ہر سپاہی سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ اُسے خود معلوم نہیں کہ یہ اچانک حملہ کہاں سے ہُوا ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے تاریکی اور سردی میں وہ کس طرف بھاگ رہا ہے۔ سب بھاگ بھی رہے ہیں، گر بھی رہے ہیں، بے ہوش بھی ہو رہے ہیں اور مر بھی رہے ہیں۔ لیکن ستم کی بات یہ ہے کہ ہر ایک کو صرف اپنی جان کی فکر ہے۔ اُس کا دھیان کسی دوسرے وِیکتی یا اپنے سگے سمبندھی کی طرف نہیں۔ لڑائی کا یہ جو آخری میدان ہے، وہ لاشوں سے اٹا پڑا ہے۔ لاشیں اتنی زیادہ ہیں کہ اُنہیں دفنانے کے لیے جگہ بھی دستیاب نہیں ہو رہی۔

ہر بڑی جنگ کا انجام یہی ہوتا ہے

بھوپال میں زہریلی گیس کا حملہ دو دسمبر ۱۹۸۴ء کو آدھی رات کے بعد جُھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب لوگوں پر نازل ہوا تھا۔ ہزاروں لوگ مرے تھے اور لاکھوں ایسی ایسی بیماریوں کا شکار ہوئے تھے، جن کا علاج سات سال میں بھی نہیں ہو سکا اور شاید اب ہو بھی نہیں سکے گا۔ جتنے معذور وہ لوگ سات برس پہلے تھے، اُتنے ہی معذور وہ اب بھی ہیں۔ ابھی تک تو معاوضے کی وہ رقم بھی اُنہیں نہیں ملی جو اُنہیں دی جانی تھی۔ یہ جنگ بھی دراصل ہَیو، اور ہَیو ناٹس، کی جنگ ہے۔ ایک سرمایہ دار تجارتی کمپنی اپنی پوری قوم کے بل بوتے پر اپاہج، معذور، بے کس، غریب اور ہارے ہوئے لوگوں کو جینے کے حق سے محروم کرنے پر تُلی ہے۔

میرے ناول کی ہیروئین سرجو، ایک سمبل ہے اُس بہت بڑی اور طویل جنگ کا، جو ہم سب اپنے اپنے محاذوں پر اکیلے لڑ رہے ہیں (مجموعی طور پر ہم جنگیں لڑ ہی نہیں سکتے کیونکہ ہمارے یہاں مجموعی طور پر فیصلے کرنے کا رواج نہیں)، میں نے اِس سمبل ہی کو ہر لڑائی کا عنوان مانا ہے۔ چاہے

وہ لڑائی نجی جذبات اور احساسات کی ہو۔ چاہے انیائے اور جھوٹ کے خلاف ہو۔ چاہے غلط رسم ورواج اور روایات کے وِرُدھ ہو۔ چاہے وہ فرد کی اپنی سوچ اور سمسیاؤں کی لڑائی ہو۔ جنگ کوئی بھی ہو۔ محاذ ایک ہی ہے۔ اُس محاذ پر کھڑے ہو کر۔ ہم مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور تعمیری قدروں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

اس ناول کو میں نے پانچ سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اور کافی حصّہ لکھ بھی ڈالا تھا۔ لیکن میں خود بھوپال جا کر اُن بستیوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو دو دسمبر کی رات کو اُجڑی تھیں۔ کچھ ایسے لوگوں سے بھی ملنا چاہتا تھا جو اب تک ذہنی اور جسمانی کرب اور تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اس لیے ناول کو مکمل کرنے میں کافی سمے لگ گیا۔ ناول کا مسوّدہ جب شاہد علی خاں کو دیا تو لگتا تھا کہ فوراً ہی چھپ جائے گا۔ مکتبہ جامعہ سے میری جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، کسی میں بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ بس اسی ناول کی تقدیر میں پڑھنے والوں کے سامنے جلد آ جانا نہیں لکھا تھا۔ اِدارے کی کچھ مجبوریوں کے کارن ناول دو سال تک نہیں چھپ سکا۔ شاہد صاحب سے میرے تعلقات اس قسم کے ہیں کہ میں اُنھیں ناول کا مسوّدہ لوٹا دینے کو بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

بہرحال ناول اب چھپ کر آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ اُسی مہینے میں چھپ رہا ہے۔ جس مہینے کے شروع میں، بھوپال کے لوگوں پر یہ آفت ٹوٹی تھی۔ بھوپال کے یہ آفت زدہ، کمزور اور معذور لوگ نمائندے ہیں، ان کروڑوں اِنسانوں کے جو تھرڈ ورلڈ کنٹریز میں، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں، ہر لمحہ قِسم قِسم کی زہریلی گیسوں کا زہر پیتے ہُوئے فنا کے راستوں پر بڑھے بھی جا رہے ہیں اور مخالف ہواؤں کا مقابلہ بھی کر رہے ہیں۔

میرا یہ وشواس ہے کہ جب تک لشکر کا آخری سپاہی زندہ ہے منفی قوتوں کے خلاف یہ جنگ جاری رہے گی کہ اِسی میں بنی نوعِ انسان کی سلامتی مُضمر ہے۔

کشمیری لال ذاکرؔ

۴ دسمبر ۱۹۹۱ء

۳۶۷۔ سیکٹر ۴۴ اے۔ چنڈی گڑھ

آنند

آنند ایک عرصے سے فری لانسنگ کرتا چلا آرہا تھا، اخباروں اور جرنلز میں بھی ور عورتوں کے معاملے میں بھی۔ اس فری لانسنگ کی عادت نے اُسے کہیں ایک جگہ یا ایک اخبار یا ایک لڑکی سے جُڑا نہیں رہنے دیا تھا۔ اب اس کی یہ عادت اتنی پکّی ہوگئی تھی کہ وہ کسی ایک شہر میں بھی دو تین روز سے زیادہ نہ ٹِک سکتا تھا۔ ایک اضطراب تھا جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ ایک تڑپن تھی جو اس کی رُوح کو گھُلائے جارہی تھی۔ وہ پہاڑوں پر جاتا تو ان کی ٹھنڈک، سرد اور نم آلود ماحول اسے سکون دیتا۔ سمندر کے کنارے جاتا تو اُسے لگتا جیسے سمندر کی لہریں دن میں ہزاروں بار کناروں اور سمندر میں اُبھری ہوئی چٹانوں سے اپنا سر ٹکراتی رہتی ہیں۔ شاید یہ بچاری کنیا کمُاریاں جب سے اسی طرح اپنے سر پھوڑتی چلی آرہی ہیں، جب سے ساگر کا منتھن ہُوا تھا اور امرت اور زہر الگ کیا گیا تھا۔ ساگر کی یہ کنیائیں، یہ کنواری، اچھوتی، پوتر لہریں امرت کی تلاش میں ہیں یا زہر کی، یہ بات شاید وہ ابھی تک نہیں جان پائی تھیں۔ اس لیے جب کبھی وہ سمندر کے کنارے جاتا تو اس کی تڑپن اور بھی بڑھ جاتی۔ اسی لیے وہ ساؤتھ میں کم جاتا تھا۔ اس کا زیادہ عشق پہاڑوں اور دریاؤں اور جھیل کے

درختوں اور برف سے ڈھکی چوٹیوں سے تھا، سمندر کے کنارے میلوں پھیلی کالی، بھوری سفید ریت اور اس پر بکھری چمکتی ہوئی رنگ برنگی سیپیوں سے نہیں تھا۔ لگتا تھا فری لانسنگ کرتے کرتے اب وہ تھکنے لگا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اپنے ٹیلنٹ کو دوسروں کے لیے برباد کرنے کے بجائے اُسے اپنے کام میں لائے۔

اس نے سوچا کہ وہ اپنا ایک اخبار نکالے۔ شروع شروع میں اسے فورٹ نائٹلی رکھے بعد میں ویکلی کر دے۔ اب اس نے ہر قسم کے اخبار اور جرنلز دیکھ لیے تھے۔ ایک کامیاب فورٹ نائٹلی کیسا ہونا چاہیے، جسے لوگ پسند کریں، یہ اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کچھ سنسنی پھیلانے والی خبریں، کچھ فلمی کالم، عورتوں کے لیے ایک صفحہ حکومت اور سیاست کے متعلق چونکا دینے والے اداریے۔ سیکس اور کامکس۔ بس یہی مسالہ تھا جو ایک عام پڑھنے والے کو چاہیے، جسے وہ تمباکو کی طرح منہ میں ڈالے، سُرور بھی ملے اور تھوڑا بہت سوچتا بھی رہے، سیاسی لیڈروں کے بارے میں، فلمی ہیروئینوں کے متعلق، سیکس کے سمبندھ میں اور کبھی کبھی کامکس پڑھ کر مسکرا بھی دے اور منہ میں پڑے تمباکو کو ہونٹ بند کر کے زبان کے نیچے بھی دبالے، جیسے اس کا ذہن عورتوں کی تصویروں کو اپنے جسم سے چمٹاتا ہے۔

جتنے پاپولر جرنلز تھے ان کا سب کا یہی انداز تھا۔ اب یہ اخبار کے ایڈیٹر کی اپنی انفرادیت پر ڈی پینڈ کرتا تھا کہ وہ اسے کس ڈھنگ سے جرنلز کے ہجوم سے بچا کر اپنے جرنل یا اخبار کو الگ آئی ڈینٹیٹی دے۔ بس اس طرح کے خیال تھے آنند کے۔

اسی کارن وہ چنڈی گڑھ سے کیرلا آیا تھا۔ ٹرین میں بیٹھا راستے بھر وہ ناریل کے گھنے پیڑوں، پام کے درختوں اور سرسبز کھیتوں کو دیکھتا رہا تھا۔ یہ منظر اُسے ہندستان میں کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ گھروں کے آنگنوں میں، آن کے آس پاس، ناریل کے پیڑ انھیں اس طرح گھیرے ہوئے تھے کہ چھوٹے چھوٹے کچے گھر، چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح، ہریالی کے سمندر میں چھوٹی چھوٹی

کشتیوں کی مانند اُبھر رہے تھے۔ جیسے ہر گھر ایک کشتی تھی جو ہریالی کے سمندر میں تیر رہی تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے گہرے سانولے ننگے جسموں والے لوگ اپنی لُنگیوں کو دوہرا کر کے کمر کے گرد لپیٹے ہوئے، گہرے پانیوں میں اپنے اپنے جال ڈال کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ جب وہ اپنے اپنے بھاری جال پانی سے باہر نکال کر انھیں اپنی کشتیوں پر انڈیلتے تھے تو رنگ برنگی، ہر قسم اور ہر سائز کی مچھلیاں دھوپ میں تڑپنے لگتیں تھیں۔

کیرلا کا ہر گھر سمندر کی لہروں میں ڈولتی ایک کشتی ہے۔ یہی احساس ہوا تھا آنند کو کیرلا میں گھومتے ہوئے۔ اور ہر کشتی میں ایک چھوٹی سی الگ دنیا ہے اور اس دنیا کے الگ قانون ہیں، الگ رسم و رواج اور الگ رشتے ہیں اور اپنا ایک الگ کلچر بھی ہے۔

بلکہ ایک بار تو اُس نے یہ بھی سوچا کہ وہ یہیں کہیں ایک چھوٹا سا گھر لے کر بس جائے اور اپنے آپ کو سب سے الگ کرلے۔ فری لانسنگ چھوڑ دے اور زندگی کو نئے ڈھنگ سے شروع کرے اور دیکھے کہ زندگی اسے کیا دیتی ہے۔ لیکن سمندر کی لہریں اس کی تڑپن کو اور گہرا، دل کو زیادہ بیقرار اور ادھک اشانت کر دیں گی۔ اور پھر ناریل کے یہ اونچے اونچے پیڑ، دھان کے یہ سرسبز کھیت اور چھوٹے چھوٹے کچے گھر بھی اسے زیادہ دیر نہ باندھ پائیں گے۔

اُسے لگا کہ وہ یہاں زندگی بھر نہیں رہ سکتا۔ دراصل وہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا تھا کہ وہ زندگی بھر کہاں رہے۔ چنڈی گڑھ اسے پسند تھا۔ وہ کئی برسوں سے اس شہر میں رہ رہا تھا۔ لیکن دِی سٹی بیوٹی فُل بھی تو اُسے باندھ نہیں پایا تھا، اس شہر میں اس کے لیے بہت سی دلکشیاں تھیں۔ لیکن بندھن کوئی نہیں تھا اور بنا بندھن کون کہیں رہ سکتا ہے ہمیشہ۔

اُسے تین دن ہو گئے تھے تری وینڈرم آئے، ان دنوں میں وہ تین ہوٹل تبدیل کر چکا تھا۔ اور اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کنیا کماری جائے گا اور وہیں سے

مدراس چلا جائے گا۔ جہاں کچھ دوستوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ اپنا الگ اخبار چلانے میں وہ اس کی ہر ممکن مدد کریں گے۔

اب وہ ایم ایل اے ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اس کے جرنلسٹ دوستوں کو بھی یہاں آنے میں آسانی تھی۔ اور اسمبلی ہال اور سیکریٹریٹ بھی قریب تھے۔ ہاسٹل کا منیجر ایک لمبی سفید داڑھی والا ملیالی تھا جو سفید کرتے اور دھوتی میں بڑا پُروقار لگتا تھا۔ وہ صبح صبح اپنے ماتھے پر چندن کی تین موٹی موٹی لکیریں سجائے ایک بار ہاسٹل کے سب کمروں میں جاتا تھا اور سب سے پوچھتا تھا کہ انھیں کوئی تکلیف تو نہیں۔

آنند نے شام کو ایم ایل اے ہاسٹل میں شفٹ کیا تھا اور پہلا شخص جو اس سے ملنے آیا تھا وہ ہاسٹل کا منیجر ہی تھا۔ وہ ہندی یا اردو تو نہیں سمجھتا تھا لیکن انگریزی میں بات چیت کر سکتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنند سے کہا تھا۔

"آئی ایم لکشمی نارائن، منیجر آف دی ہاسٹل۔"

"پلیزڈ ٹو میٹ یو۔"

"یو آر اے جرنلسٹ فرام چنڈی گڑھ؟"

"یس۔"

"ہاؤ از چنڈی گڑھ؟"

"برائٹ ایز یو ول۔"

لکشمی نارائن بڑے دلکش انداز سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کی لمبی سفید داڑھی کی طرح اُجلی تھی۔

"شیل آئی سینڈ یو کافی؟"

"یس پلیز۔ ویری ہاٹ کافی۔"

لکشمی نارائن جواب دیئے بغیر چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہاسٹل کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے ایک چھوکرے چندرن کے ساتھ خود کافی

لے کر آیا۔

"پُش دِس بیل وین یُو نیڈ اینی تِھنگ "۔ اس نے دیوار پر لگے سوئچ بورڈ کے ایک سوئچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے ریسٹورنٹ کے چھوکرے کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے چلا گیا۔

آنند صوفے پر بیٹھ کر گرم کافی پیتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔

شام کو اس کا ایک جرنلسٹ دوست اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہیں اس نے کھانا کھایا اور وسکی بھی پی۔ آنند جب واپس ہاسٹل آیا تو ہاسٹل کا ریسٹورنٹ بند ہو چکا تھا اور اس کا منیجر لکشمی نارائن بھی جا چکا تھا۔

اگلی صبح وہ ہاسٹل ہی میں ناشتہ کر کے باہر نکل آیا۔ دوپہر کا کھانا اسے پریس کلب میں کھانا تھا۔

ہاسٹل کے ریسٹورنٹ میں سارے اخبار ملیالم زبان کے تھے۔ ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے چھوکرے ٹیبل سروس بھی کرتے رہتے تھے اور ایک بڑی سی میز پر کھلے اخباروں کے صفحوں کو بھی قسطوں میں پڑھتے رہتے تھے۔ کیرلا ساکھشرتا کے کھیشتر میں ہندستان میں پہلے نمبر پر تھا۔ اس کا اثر لوگوں کی سماجی زندگی پر بھی پڑا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ تھری وہیلر چلانے والے، چائے کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر چائے پینے والے، ریلوے اسٹیشنوں پر سامان اٹھانے والے قلی، اخبار پڑھ لیتے تھے۔ بلکہ آنند نے تو یہاں تک بھی دیکھا تھا کہ ایم ایل اے ہاسٹل میں صفائی کا کام کرنے والی عورتیں، نیلی ساڑھیاں اور سفید بلاوز پہنے اور بڑی صاف ستھری، اپنے منہ میں پان دبائے ہر فلور کے آخری کونے میں بیٹھی، کام سے فارغ ہو کر اخبار دیکھتی تھیں۔ ہندستانیوں کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں یہ کتنا بڑا فرق تھا۔ دوسرے صوبوں میں، اُن صوبوں میں بھی جہاں کی ساکھشرتا کی در قومی در کے برابر تھی، عوام میں ساکھشرتا کا عملی اور سماجی استعمال بہت کم تھا۔ یہاں تک کہ چنڈی گڑھ میں بھی جو ساکھشرتا کے لحاظ سے دوسرے نمبر

پر تھا، اس طرح کا عملی استعمال عوام کی زندگی میں نہیں تھا۔

اسمبلی ہال کے سامنے، مہاتما گاندھی روڈ پر، وہ ایک بُک شاپ پر جس کا نام بھی "کرنٹ بُکس" تھا تازہ اخبار خرید رہا تھا اور انھیں سرسری طور پر دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ اُس نے دکان کے مالک کو یہ بتایا تھا کہ وہ جرنلسٹ ہے اور چنڈی گڑھ سے آیا ہے۔ جبھی تین لڑکیاں بُک شاپ میں داخل ہوئیں۔ آنند نے ایک نظر انھیں دیکھا تو اُسے لگا کہ وہ لڑکیاں ملیالم لڑکیاں نہیں تھیں۔ پھر وہ دکان کے مالک سے خالص کانوینٹ کے لہجے میں بات کرنے لگیں اور آنند اخبار دیکھنے میں محو ہو گیا۔ کچھ لمحوں بعد دکان کا مالک اُن تینوں لڑکیوں کو اُس کے قریب لے آیا اور بولا۔

"سر، دِیز گرلز آر آلسو فرام چنڈی گڑھ؟"

اور اُس کے ساتھ ہی تینوں جوان اور صحت مند لڑکیوں کی خوشگوار مسکراہٹ نے اُس کا سواگت کیا۔

"وٹ آر یُو ڈوانگ اِن چنڈی گڑھ؟"

"آئی ہیو ڈن مائی ایم اے فائنل اِن انگلش۔ مائی نیم از بلجندر۔"

"فائن۔"

"مائی نیم، از دلجیت اینڈ آئی ایم ڈوانگ ایم۔ بی۔ اے۔"

"گڈ۔"

"آئی ایم سرجُو۔ اینڈ اے سٹوڈنٹ آف ماس کمیونیکیشن۔"

"مائی سبجیکٹ۔"

آنند مسکرا کر سب سے متعارف ہوا اور پھر بولا۔

"ہُن ہیں وی اپنی انٹروڈکشن دیاں۔"

"جی ضرور۔" سرجُو نے جواب دیا۔

"آئی ایم آنند، اے فری لانسر۔"

" آنند سہگل ؟ "

" یس ." اس نے سرجو کے سوال کا جواب دیا۔

" تُسی تے ساہڈے ڈیپارٹمنٹ وچ وی آئے ہو دو اِک وار ."

" جاندا رہناں میں ، ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ وِچ ."

" میں تے تہوانوں ٹی وی تے وی ویکھیا اے ." بلجندر نے کہا۔

" ضرور ویکھیا ہو ویگا۔ جالندھر ٹی وی تے ناں ؟ "

" جی ."

" پر میں تہوانوں کِدھرے وی نہیں ویکھیا " دلجیت نے کہا اور پھر تینوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔

" ایتھے ٹری وینڈرم وِچ تے دیکھ لیا ہے ناں ."

" جی ." سب کا ایک زور دار قہقہہ گونجا ، جس میں بُک شاپ کے مالک کا بھی قہقہہ شامل ہو گیا۔

" پنجابیز آر فُل آف لائف ." اس نے کہا۔

" تھینکس فار دی کامپلی مینٹس ." آنند نے جواب دیا ." وُڈ یو بینڈ پیپرز ٹو دی ایم۔ ایل۔ اے ہاسٹل ؟ "

" سرٹنلی سر ." اس نے جواب دیا۔

" اِز دیر اینی گُڈ ریسٹورنٹ نیر بائی ؟ " آنند نے پوچھا۔

" یس سر جسٹ آفٹر اے فیو شاپس ، پنکج ہوٹل ."

" تھینکس ۔ آؤ تہوانوں کافی پلاواں ." آنند نے کہا۔

اور وہ تینوں لڑکیوں کے ساتھ بُک شاپ سے باہر نکل آیا۔

پنکج ہوٹل میں وہ چاروں کافی بھی پیتے رہے اور بات چیت بھی کرتے رہے۔

" کیسے آئی ہیں آپ تینوں ٹری وینڈرم میں ؟ "

" دراصل ہم ساؤتھ درشن پر نکلی تھیں کوئی دس دن پہلے "۔ بلجندر نے جواب دیا۔

"کہاں کہاں گھوم آئیں اب تک "۔

" پہلے ہم رامیشورم گئیں پھر مدورائی، پھر ترویتی، پھر مدراس اور پھر میسور۔ اب بنگلور سے ٹری وینڈرم آئی ہیں "۔

" ٹری وینڈرم کب پہنچیں ؟"

" کل شام "۔ جواب دلجیت نے دیا۔

" اب کیا پروگرام ہے ؟"

" آج ہم ٹری وینڈرم میں گھومیں گی اور کل کنیا کماری جائیں گی "۔

" آپ نے مون برت رکھا ہوا ہے۔ ایک دم خاموش ہیں"؟ اس نے سرجو کو مخاطب کیا۔

" نہیں یہ بات تو نہیں "۔

" تو میرے اس سوال کا جواب آپ دیں گی "۔

" کس سوال کا ؟"

" سوال تو آپ نے کیا ہی نہیں کوئی سر"۔ بلجندر بولی۔

" اگر آپ کا سارا پروگرام کل ختم نہ ہوا تو کیا کریں گی ؟"

" ہمارا ریزرویشن پرسوں کا ہے۔ کیرلا ایکسپریس سے۔ کوشش کریں گے کہ پروگرام ختم ہو جائے "۔

" ایک سوال میں کروں آپ سے ؟ سرجو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" ضرور "۔

" آپ کا کیا پروگرام ہے ؟"

" میں کل دوپہر کے بعد جانے کی سوچ رہا ہوں "۔

" اور اگر آپ کا پروگرام بھی ختم نہ ہوا ؟"

"مجھے کھانا ایم ایل اے ہاسٹل میں ہی کھانا ہے۔ وہیں کچھ لوگ مجھ سے ملنے بھی آرہے ہیں ایکسکیوز می۔"

"تو آپ ہمیں ہماری لاج میں چھوڑ کر ہاسٹل چلے جائیں گے؟"

"یس سر جُو۔"

"کل کا کیا پروگرام ہے؟"

"کل تم میرے ساتھ میتھیو جارج کے گھر ناشتہ کرنے چلوگی۔"

"میتھیو جارج کون ہے؟"

"ایک لوکل ڈیلی کا چیف رپورٹر۔"

"آپ نے ہمارے بارے میں کہہ رکھا ہے اُسے؟"

"ہاں۔"

"تو ہم ہاسٹل میں آجائیں صبح؟"

کوئی آٹھ بجے کے قریب، روم نمبر تیئیس ۲۳۔"

"بریک فاسٹ کے بعد کیا پروگرام ہے؟" بلجندر نے پوچھا۔

"پھر ہم لوگ کنیا کماری چلیں گے اور رات کو لوٹ آئیں گے۔"

"رات کو وہاں نہیں رُکیں گے ہم؟"

"اگر تم کیرلا ایکسپریس سے نہیں جانا چاہتیں تو رات وہیں رک جانا۔ تمہارا انتظام کرادوں گا۔"

"اور آپ؟ سرجُو نے پوچھا۔

"مجھے تو واپس آنا ہے۔ آئی ایم ناٹ اون اے پلیڈر ٹرپ، یُو نو۔"

"تو پھر ہم بھی واپس آجائیں گی۔ سن سیٹ دیکھ کر۔"

"اینڈ یُو لائک۔"

آنند تینوں لڑکیوں کو سرسوتی لاج میں چھوڑ کر ایم ایل اے ہاسٹل گیا۔ بہت رات گئے اپنے کمرے میں اُس نے تھوڑی سی وسکی پی۔ عام طور سے کھانے کے

بعد وہ وسکی نہیں پیتا تھا۔ لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ جو کبھی کبھی اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھنے لگتی تھیں۔ آج ویسا ہی کچھ ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔ کوالم پیچ پر ہی شروعات ہوگئی تھی۔ یہ لمحے نہ صرف اسے ذہنی طور پر ہی پریشان کرتے تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی وہ ٹوٹ جاتا تھا۔

وہ وسکی پیتا رہا اور ان سب لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا جو اُسے آج ملے تھے۔ اس کے سارے جرنلسٹ دوست۔ اسے اچھے لگے تھے۔ ان سب نے اسے اپنا اخبار نکالنے پر مبارک دی تھی اور ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا تھا۔ ان ہی کے کہنے پر تو وہ کل مدراس جا رہا تھا۔

سوچ کی کڑیاں جُڑتے جُڑتے آخر ان تینوں لڑکیوں پر آکر ختم ہوگئیں۔ یہ لڑکیاں اس زنجیر کی آخری کڑی تھیں۔ یہ تینوں پنجابی لڑکیاں متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تینوں کے سامنے اپنا اپنا مستقبل تھا۔ شاید کیریر بھی۔ دلجیت تو ایم۔ بی۔ اے کرکے کسی فیکٹری میں لگ جائے گی۔ بلجندر شادی کے بعد کیا کرے گی، اس کے بارے میں اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اور سرجُو جرنلزم میں جانا چاہتی تھی۔ اس نے آنند کے اخبار میں کام کرنے کی آفر بھی دے دی تھی۔ اُسے جانے کیوں سرجُو کا نام بہت اچھا لگا۔ وہ اُس سے کل دریافت کرے گا کہ یہ نام کس نے رکھا تھا؟ وہ ضرور کسی ایسی فیملی سے ہوگی جو دھرم کرم میں وشواس رکھتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک وسکی بھی نہیں پی سکا۔ سگریٹ سلگا کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرکے چنڈی گڑھ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے آٹھ دن ہوگئے تھے گھر سے آئے ہوئے۔ فری لانسر کا گھر بھی کیا ہے! رات گزارنے کا ایک ٹھکانہ۔ ایک بہت ہی ان آرگنیائزڈ زندگی۔ کہیں بھی تو کوئی ترتیب نہیں۔ اور اب وہ جا رہا تھا ایک فورٹ نائیٹلی نکالنے۔ صرف دوسروں کے بھروسے پر۔ کسی نے بھی ہاتھ کھینچ لیا تو ہاؤس آف کارڈز لمحوں میں ڈھ جائے گا۔

اور اس ہاؤس آف کارڈز میں سرجُو کام کرنے کی آفر دے رہی تھی۔

"اے فوُلش گرل!"

جو صرف اُس لیے اُس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی تھی، سمندر کے کنارے، کروہ اپنے آپ کو بھول کر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے چہرے پر اچانک اداسی اُبھر آئی تھی۔ آنند نے سگریٹ کا آخری حصّہ ایش ٹرے میں پھینکا اور اُس میں سے دھوئیں کی مہین سی لکیر کو کمرے میں بکھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے کروٹ لے لی اور اپنے آپ سے بولا۔

"سرجو شرما! تمھارا اصلی استھان رام کی نگری ایودھیا میں ہے۔ تم چنڈی گڑھ کی اپوتر بھومی میں کیوں اپنا سمے برباد کر رہی ہو۔ ایودھیا لوٹ جاؤ۔ رام چودہ برس کا بن باس کاٹ کر لوٹنے ہی والے ہوں گے!"

اور پھر آنند نے بجلی کا سوئچ آف کر دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور پورے چاند کی روشنی کوالم بیچ کی ریت کو ٹھنڈا کرنے کے بعد اُس کے کمرے میں آگئی تھی جہاں اُجلے اُجلے بستر پر پڑا وہ جاگ رہا تھا۔

صبح وہ دیر سے جاگا تھا۔

اور دیر ہی سے تیار ہونے لگا تھا۔

ابھی ابھی باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا وہ اور تہمد پہنے، آئینے کے سامنے کھڑا، اپنے بال بنا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"ویٹ!" اُس نے کہا۔ تینوں لڑکیاں ہوں گی اُس نے سوچا۔

لمحہ بھر کے بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ انھوں نے شاید اس کی آواز نہیں سُنی تھی۔

"ویٹ!" اس نے دوبارہ کہا، وہ جلدی جلدی بنیان اور کرتہ پہننے لگا کہ دستک پھر ہوئی۔

"وائی کانٹ یُو ویٹ؟" وہ چلّایا۔

جلدی میں وہ بنیان پہننا بھول گیا تھا۔ کرتا اُتار کر وہ بنیان پہننے لگا تھا

کہ دستک اور بھی زور سے ہوئی۔

"گوٹو ہیل ۔" اس نے کہا اور بنا بنیان پہنے ہی دروازہ کھول دیا۔

تینوں لڑکیاں جینز پہنے چہروں پر اُجلی اُجلی مسکراہٹیں لیے جھینپ گئیں۔

"میری آواز نہیں سُن رہی تھیں تم ؟"

"نہیں ۔" سرجُو نے کہا۔

"کم اِن اِف یو لائک ۔"

تینوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اندر آگئیں اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔

آنند نے جلدی سے بنیان اور کُرتا پہنا اور کہا۔

"میں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے جاگا ہوں ۔"

"رات دیر میں سوئے تھے کیا ؟" سرجُو نے پوچھا۔

"ہاں بہت دیر میں ۔"

اسی لمحے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"اے فون کال فار یو سر ۔" ری سیپشن سے ایک آدمی آیا تھا۔

"میں تمھارے لیے کافی بھجواتا ہوں۔ ذرا ٹیلی فون اٹینڈ کر آؤں ۔"

آنند کمرے کا دروازہ بھیڑ کر گراؤنڈ فلور پر چلا گیا اور جاتے ہوئے کینٹین کے چھوکرے چندن کو اپنے کمرے میں کافی لانے کے لیے کہہ گیا۔

مینتھو کا فون تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آنند اور اس کی مہمان کب تک آئیں گے۔ اس نے نو بجے تک پہنچنے کا یقین دلایا اور پھر اس سے کنیا کماری جانے کے سلسلے میں بات کرتا رہا۔

دو ایک ٹیلی فون اُسے اور بھی کرنے تھے۔ وہ بھی کیے۔ جب وہ کمرے میں واپس آیا تو لڑکیاں کافی پی رہی تھیں۔

"آپ کافی نہیں پئیں گے ؟"

"میں صرف سگریٹ پیوں گا،" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور کہا،ہمیں میتھیو جارج کے گھر نو بجے پہنچ جانا ہے۔ اس کا ٹیلی فون تھا ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ اتنے وقت میں تو لوگ پیرس سے برسلز پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ہندستان میں ہم ایک محلے سے دوسرے محلے میں نہیں پہنچ سکتے اتنے سمے میں۔"

"کنیا کماری کے لیے ہم کب تک چل پڑیں گے؟" بلجندر نے پوچھا۔
میں نے میتھیو جارج سے ٹیکسی کا انتظام کرنے کو کہہ دیا ہے۔ بریک فاسٹ کے بعد وہیں سے چل پڑیں گے۔"

"دیٹ از فائن۔" دلجیت نے کہا۔

وہ لوگ ٹھیک نو بجے میتھیو کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا گھر سستھا منگلم کالونی میں تھا۔ نئی کالونی تھی۔ ابھی چار سال پہلے اس نے کوٹیام کے ایک گاؤں میں اپنی زمین بیچ کر اس کالونی میں زمین خریدی تھی اور اپنا مکان بنوا لیا تھا۔ چھوٹا سا مکان، ناریل کے پیڑوں، پپیوں کے پیڑوں، آم کے درختوں، کیلوں کے پیڑوں، اور کاجو کے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ گیٹ کے سامنے کا حصہ کچا تھا اور اس میں اس نے بڑے ہی خوبصورت پھول لگوا رکھے تھے۔ گھر کے دروازے تک پہنچنے کے لیے چار چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں تھیں۔ آخری سیڑھی پر میتھیو نے اپنی چپل اُتار دی۔ اسے دیکھ کر آنند اور تینوں لڑکیوں نے بھی اپنے اپنے جوتے اُتارے اور پھر میتھیو سیدھا انھیں سامنے کے کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر بچھائی خوبصورت چٹائیوں پر کیلے کے تازہ پتّے رکھے تھے۔

"میں آپ کو کیرلا کے ٹپی کل سٹائل میں بریک فاسٹ کھلا رہا ہوں۔"

"دیٹ از وٹ وِی وُڈ لائک۔" آنند نے مسکرا کر کہا۔

اتنے میں میتھیو کی بیوی اور بیٹی داخل ہوئیں۔ آنند اور تینوں لڑکیاں چٹائیوں سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"میٹ مسز میتھیو اینڈ مائی ڈاٹر مرسی۔"
دونوں ماں بیٹی نے نمشکار کے لیے ہاتھ جوڑ دیے۔
"دِس از آنند، اے رائیٹر اینڈ جرنلسٹ فرام چنڈی گڑھ۔ اینڈ ہِز تھری ینگ فرینڈز۔"
آنند اور تینوں لڑکیوں نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے نام بتائے اور اس کے بعد سب لوگ چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ مسز میتھیو جارج کچن میں چلی گئی اور مرسی نے کیلوں کے پتوں پر اُپما اور اِڈلی رکھنی شروع کی اور پھر ان کے ساتھ ساتھ ناریل کی چٹنی اور سامبر ڈالنا بھی شروع کر دیا۔
"ہم تو اتنا نہیں کھا سکیں گی۔" سرجُو نے کہا لیکن مرسی مسکراتی رہی اور کیلوں کے پتوں پر کھانے کی چیزیں پروستی رہی۔
لڑکیاں مرسی سے گفتگو کرنے میں محو ہو گئیں اور آنند اور میتھیو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جبھی مسز میتھیو آئی۔
"اگر باتیں ہی کرتے رہیں۔ گر تو سب کچھ کولڈ ہو جائے گا۔"
"یس۔" میتھیو نے کہا۔
اور پھر سب نے کیلوں کے پتوں پر پروسا ہوا ناشتہ شروع کر دیا۔
"آپ نہیں آئیں گی آنٹی؟" بلجندر نے مسز میتھیو سے کہا۔
"مرسی ول گو یو کمپنی۔"
اور پھر مرسی نے بھی اپنے لیے کیلے کا ایک پتا چٹائی کے سامنے رکھ لیا اور سب کے ساتھ بریک فاسٹ شیر کرنے لگی۔
پھر سب نے گرم گرم کافی کی پیالیاں ہونٹوں سے لگائیں اور بریک فاسٹ کی تعریف کرنے لگیں۔
اتنے میں کال بیل بجی۔ ٹیکسی والا آگیا تھا۔ مسز میتھیو جارج نے ایک بڑے سے بیگ میں بہت سے پھل ڈال دیے اور کافی سے بھری ہوئی ایک فلاسک

بھی ساتھ رکھ دی۔

"آپ کا سفر اچھا کٹ جائے گا۔" اس نے کہا۔

وہ سب لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر آنند اور پچھلی سیٹ پر تینوں لڑکیاں۔ میتھیو جارج اُس کی بیوی اور اس کی بیٹی مرسی نے سب کو ہاتھ ملا کر وداع کیا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی تو میتھیو نے شاؤٹ کیا۔

"آئی شیل کم ٹو ڈِی ایم ایل اے ہاسٹل ٹومارو ابٹ سیون تھرٹی۔"

"پلیز ڈُو کم۔"

ٹیکسی جب مین روڈ پر پہنچی تو سرجُو نے ٹیکسی کو رُکوا لیا۔ اسے آنند کا ان سب سے الگ بیٹھا رہنا اچھا نہ لگا۔ ٹیکسی رُکی تو وہ پچھلی سیٹ سے اُٹھ کر آنند کے پہلو میں کھڑکی کے پاس، اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ٹیکسی دوبارہ سٹارٹ ہو گئی۔

راستے کا وہی ہرا بھرا منظر۔ ایک ہی ختم نہ ہونے والا سرسبز علاقہ، ناریل کے پیڑوں کا گنجان جنگل اور تھوڑی تھوڑی دُوری پر کچے گھروں کی چھتیں۔ آنگنوں میں کھیلتے ہوئے بچّے اور گھروں کے دروازوں پر کھڑی عورتیں۔ جیسے آبنوس کے بُت، گھڑے رکھے ہوں کھپریل کی کُٹیاؤں میں۔ بیچ بیچ میں کسی گفتگو کے ٹکڑے کو آگے بڑھانے کے لیے آنند پیچھے مڑ کر بلجندر اور دلجیت کو مخاطب کرتا اور وہ دونوں آگے سیٹ کی بیک پر جُھک جاتیں اور اس طرح گفتگو جاری رہتی۔ کبھی کبھی سرجُو کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ اُس کی طرف جُھکتا تو سرجُو کو لگتا کہ آنند کے جسم کا کچھ حصّہ اُس کے پہلو سے سٹ گیا تھا

سرجُو نے ایک بار پوچھا۔

"آپ کے گھر میں کون کون لوگ ہیں؟"

"کون کون سے تمھارا مطلب؟"

"آپ کے علاوہ کون رہتا ہے آپ کے گھر میں؟"

"میرے علاوہ اور کون رہ سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"میرا اپنا رہنا ہی مشکل ہے۔ اکیلا رہتا ہوں۔ تن تنہا۔"

"گھر کون سنبھالتا ہے؟"

"فقیروں کے گھر بھی سنبھالتا ہے کوئی؟"

"جب آپ چنڈی گڑھ سے باہر جاتے ہیں؟"

"تو گھر میں تالا ڈال کر، چابی لینڈلارڈ کو دے آتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"گھر کی صفائی وفائی ہوتی رہے۔ میں جب لوٹتا ہوں تو میرا گھر ایکدم صاف ستھرا ہوتا ہے۔"

"آپ کا لینڈلارڈ تو بہت اچھا آدمی ہے۔"

"اس سے زیادہ اچھی اس کی وائف ہے۔"

یہ جواب سن کر سرجو کو بُرا لگا۔ اتنے میں دلجندر نے پچھلی سیٹ سے پوچھا۔

"کافی پئیں گے؟"

"کیوں سرجو؟"

"کیا؟" اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔

"کافی پیو گی؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔

تھوڑی دور پر سڑک کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی اور دلجندر نے سب کو کافی اور بسکٹ سرو کیے۔ ڈرائیور کافی کی پیالی لیے، ٹیکسی سے دور سگریٹ سلگا کر کافی پیتا رہا۔

"جرنلسٹ اور رائیٹر ہونے کے تو بہت فائدے ہیں۔" دلجیت نے کہا۔

"کیوں؟"

"بہت عزّت ملتی ہے۔"

"اور جو گالیاں ملتی ہیں اُنھیں، کبھی سُنی ہیں تم نے؟"

"گالیاں بھی ملتی ہیں؟"

"ایسی ایسی گالیاں کہ سننے سے پہلے کانوں میں اُنگلیاں دے لو م۔۔ پنجابی کی گندی گندی گالیوں سے بھی زیادہ لچر اور ناقابل برداشت۔"

سرجُو ایکدم خاموش تھی اور دھیرے دھیرے کافی سُٹرک رہی تھی۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" آنند نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا؟" اُس نے جیسے مجبوری سے مسکرا کر کہا۔

"اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے۔" بلجیندر بولی۔

"بہت زبان کھُل گئی ہے تمھاری۔" سرجُو نے ڈانٹ دیا۔

جب ٹیکسی دوبارہ سٹارٹ ہوئی تو سرجُو اگلی سیٹ پر نہیں بیٹھی۔ پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کچھ کہہ دیا آنند صاحب نے؟" بلجیندر نے اُس کے کان میں دھیرے سے کہا۔

"شٹ اپ۔" سرجُو نے چیختے ہوئے جواب دیا اور آنند نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"سمتھنگ پرسنل۔"

"وائی آر یو ڈوانگ اِٹ رائیٹ اون دی روڈ؟"

آنند نے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر اپنی سیٹ پر جم کر بیٹھ گیا۔

کوئی ایک بجے کے قریب وہ کنیا کماری پہنچے۔ بھوک کسی کو نہیں تھی۔ ایک وے سائڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر سب نے فروٹ جوس کا ایک ایک گلاس پیا۔

پھر آنند نے کہا۔
"کنیا کماری ٹیمپل تو اب پانچ بجے کے بعد کھلے گا۔ اتنی دیر میں ہم لوگ۔۔ ویویکانند راک پر ہو آتے ہیں۔ وہاں سے لوٹ کر بازار میں گھوم لینا۔ کچھ پرچیزز کرنی ہوں تو وہ کر لینا۔ اس کے بعد مندر ہو آنا۔"
"آپ نہیں جائیں گے مندر میں؟" بلجندر نے پوچھا۔
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"میری دیوی دیوتاؤں میں بہت آستھا نہیں ہے۔"
"یہ وہ کام نہیں کریں گے جو دوسرے کریں۔" سرجو نے کومینٹ کیا۔
"ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔"
"دوسری وجہ کیا ہے؟" دلجیت نے سوال کیا۔
"ساؤتھ کے مندروں میں کپڑے اُتار کر اور لنگی پہن کر جانا پڑتا ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں۔"
نارتھ کے مندروں میں تو ایسا نہیں ہے؟" بلجندر نے کہا۔
"نہیں۔"
"یہاں کیوں ایسا رواج ہے؟"
"اِن مندروں میں سونا چاندی بہت ہے، کیونکہ کوئی حملہ آور یہاں تک نہیں پہنچا۔ وہ نارتھ اور زیادہ سے زیادہ گجرات تک لُوٹ مار کر کے واپس ہو گئے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے۔"
"کپڑے نہیں پہنے ہوں گے تو کوئی بھی یاتری کچھ چُرا نہیں سکے گا۔"
"اِزاِٹ؟ دلجیت نے پوچھا۔
"یہ جرنلسٹ کا خیال ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ دُرست بھی ہو۔" سرجو بولی۔
"یہ بالکل ضروری نہیں۔" آنند نے مسکرا کر جواب دیا۔

پھر انھوں نے فیری کے ٹکٹ لیے اور تامرا پاریکا بوٹ میں ویویکا نند راک تک پہنچنے کے لیے بیٹھ گئے۔ جب بوٹ چلا تو وہ لہروں کے بہت بڑے ریلے کی زد میں آکر جھول گیا اور سرجو جو آنند کے ساتھ بیٹھی تھی ایکدم اُس سے چمٹ گئی۔

"ڈر گئی ہو؟"

"ہاں۔"

"ڈر آدمی کو بہت کمزور کر دیتا ہے۔"

"اور شک میں بھی ڈال دیتا ہے۔"

"زیادہ مت سوچا کرو۔" آنند نے کہا اور جب بوٹ لہروں کی زد سے نکل کر راک کی طرف گھوما تو سرجو کے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

تامرپاریکا بوٹ جب کنارے پر لگا تو پہلے آنند، پھر سرجو اور بلجندر اور دلجیت اترے اور راک کی طرف چل پڑے۔ آنند اپنا کیمرہ ساتھ نہیں لایا تھا۔ سرجو اپنا کیمرہ لے آئی تھی۔ وہ اس نے ریسپشن پر جمع کروایا اور پھر وہ اس چٹان پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگے، جسے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں ملک کے مختلف علاقوں سے، دیکھنے کے لیے آتے تھے۔

جب وہ چاروں ویویکا نند راک کی طرف جانے لگے تو ڈیوٹی پر کھڑے آدمی نے روک دیا اور کہا کہ پہلے وہ چرنا منڈپم میں ہو کر آئیں۔

یہ مندر پاروتی کا مندر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں بیٹھ کر پاروتی نے شوجی کو پانے کے لیے تپسیا کی تھی۔ اس مندر میں پاروتی کے پاؤں کا نشان موجود ہے۔ جو روشنی میں چمکتا ہے اور دیکھنے والے اُس کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دیتے ہیں۔ پھر وہ اس منڈپم کے دروازے کے اندر داخل ہوئے جہاں سب سے اونچی چٹان پر سوامی ویویکا نند کا لائف سائز بُت نصب ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے کہ اسی جگہ پر بیٹھ کر ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ دسمبر ۱۸۹۲ء کو سوامی ویویکا نند نے تپسیا کی تھی۔ اس منڈپم میں لگے پتھروں کے بڑے بڑے سلیب اس طرح چمک رہے تھے جیسے ابھی

ابھی کسی نے پانی سے ہر ایک سلیب کو رگڑ رگڑ کر دھویا ہو۔

اس منڈپم سے نکل کر وہ چاروں ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو کر بیکراں پانیوں کو دیکھ رہے تھے۔ تین سمندروں کا پانی آپس میں مل رہا تھا۔ بحیرہ عرب، خلیج بنگال اور ہند مہا ساگر کا سنگم ہو رہا تھا یہاں۔ تینوں سمندروں کے پانی کا الگ رنگ نظر آتا تھا دھوپ میں۔ بحیرہ عرب کا ہلکا سرخ رنگ، خلیج بنگال کا ہلکا سا نیلا رنگ اور ہند مہا ساگر کا سفید رنگ۔ تینوں سمندروں کے پانی اپنی اپنی انفرادیت کھو کر ایک ہو رہے تھے۔ جیسے تین دُنیائیں اپنے اپنے الگ رنگ اور نسل اور کلچر کو بھول کر ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں اور اس بات کا ثبوت پیش کر رہی تھیں کہ انسان کا اصلی اور حقیقی روپ تو سچ ہے اور امرتا اور سُندرتا ہے۔ انسان جب اپنی عظمت کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ امر اور سُندر ہو جاتا ہے!

اور پھر چاروں 'دھیان منڈپم' کے نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایکدم شانت اور خاموش۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں بیٹھے تھے دھیان لگائے۔

بلجندر، دلجیت اور سرجُو فرش پر بیٹھ گئیں اور آنند ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سامنے چمکتے ہوئے "اوم" پر جمی رہیں اور وہ خالی الذہن اس نیم اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ تینوں لڑکیوں نے آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد آنند 'دھیان منڈپم' سے باہر نکل آیا اور سمندر کی اتھاہ وُسعت کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں تینوں لڑکیاں بھی باہر آ گئیں۔

"آپ دھیان میں نہیں بیٹھے؟" بلجندر نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟ دلجیت نے سوال کیا۔

"یہ محض ڈھکوسلے ہیں، مجھے ان میں یقین نہیں، جتنا دھیان اکیلے میں وسکی پینے سے لگتا ہے، اتنا کسی اور طریقے سے نہیں لگتا۔"

سرجُو نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اُس کی بات سُن رہی

تھی۔

"تم نے کیا بات سوچی منڈپم میں؟"

"یہ تو صرف اپنے ہسبینڈ کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔" دلجیت نے کہا۔

"اور تم؟"

"میں ایم بی اے کے ایگزام کے بارے میں سوچتی رہی۔"

"اور تم نے کس بات پر دھیان جمایا سرجو۔"

"میں تو آپ کے فورٹ نائیٹلی کی سپھلتا کے بارے میں دعا کرتی رہی۔"

"تھینک یو سرجو۔"

اور پھر وہ چاروں ہلکے ہلکے گرم پتھروں کی سلوں پر گھومتے رہے، جن کے اوپر چٹان کے ایک حصے پر "اوم" کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

اور پھر وہ "بھاگی رتھ بوٹ" میں بیٹھ کر واپس دوسرے کنارے پر آ گئے۔ سرجو اپنا کیمرہ ریسپشن جسے لینا بھول گئی تھی۔ اُسے بوٹ سے اتر کر واپس جانا پڑا اس کے ساتھ بلجندر بھی گئی تھی۔

کنارے کے دوسری طرف آنند اور دلجیت انتظار کرتے رہے دونوں کے آنے کا، وہ اب دوسرے بوٹ میں آئیں گی۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد۔

اور پھر کنیا کماری کے مندر کے باہر اُپاسکوں کی ایک لمبی قطار لگ گئی حالانکہ مندر کے دوار کھلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

کالے رنگ کی لُنگیاں دوہری کر کے، اپنی کمر کے گرد لپیٹے کیرلا کی کئی جگہوں سے آئے ہوئے اُپاسک تالیاں بجا بجا کر آئی یپا، آئی یپا، کی دُھن لگا رہے تھے۔

قطار میں کھڑے تھے چاروں اُپاسک۔ آنند، سرجو، بلجندر اور دلجیت۔ سرجو نے پوچھا تھا۔

"یہ لوگ کالی لُنگیاں پہنے اونچی اونچی آواز میں کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اپنے دیوتا آئی یپن کی آرادھنا کر رہے ہیں۔"

"آئی یپن کون سا دیوتا ہے؟"

اس دیوتا کے بارے میں بتاتے ہوئے آنند نے کہا کہ اس نے بھی یہ واقفیت اپنے جرنلسٹ دوستوں سے ہی حاصل کی تھی۔

مندر کے دوار کھلے تو لوگ اندر جانے کے لیے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ آنند نے کہا۔

"تم درشن کر آؤ۔ میں گیٹ پر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔"

"آپ کیوں نہیں چلتے؟"

"مجھے کپڑے اتار کر مندر کے اندر جانا پسند نہیں۔"

"تو ہم بھی نہیں جاتے۔" بلجندر نے کہا، وہ قطار سے نکل آئی اور اس کے ساتھ ہی سرجو اور دلجیت بھی نکلنے لگیں۔

"تم ضد نہ کرو درشن کر آؤ۔"

"آپ کے بغیر نہیں جائیں گی ہم۔" سرجو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آنند نے ہار مان لی۔ اس نے اپنی قمیص اور بنیان اتار کر کندھے پر ڈال لی اور قطار میں کھڑا ہو گیا۔ لڑکیوں نے سفید دھوتیاں اپنی کمر کے گرد پہلے ہی لپیٹ لی تھیں۔

سرجو نے جو آنند کے آگے کھڑی تھی، گھوم کر آنند کے ننگے جسم کی طرف دیکھا۔ اس کی چوڑی چھاتی اور اس پر گھنے سیاہ بال، جانے کیوں مندر کے دوار پر کھڑی سرجو کے جسم میں ایک تھرتھری سی پھیل گئی۔ اس نے فوراً آنکھیں پھیر لیں اور اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں میں خوب زور سے دبا لیا، جیسے پرائشچت کر رہی ہو اپنے پاپ کا، مندر کے دوار پر کھڑی کنواری کنیا، کسی مرد کے جسم کی کشش کے بارے میں سوچے۔ اس سے بڑا اور پاپ کیا ہو سکتا ہے۔ مینکا نے بھی تو یہی پاپ کیا تھا جب اس نے رشی وشوامتر کی تپسیا بھنگ کی تھی۔ تو کیا وہ آنند کی تپسیا بھنگ کر رہی تھی؟

ایک بار پھر سرجُو نے پیچھے گھوم کر دیکھنے کی کوشش کی تو آنند نے ٹوک دیا۔
"کیا بات ہے سرجُو؟"
"کچھ نہیں۔" اُس نے نظریں ہٹالیں اور اپنے ہونٹ پر دانتوں کے دباؤ کو اور بھی شدید کر دیا۔

دیوی کے درشکوں کی قطار بہت لمبی تھی، جو مندر کے وسیع کمروں کے اندر ہی اندر آہستہ آہستہ آگے سرک رہی تھی، مندر کے اُس دوار کے سامنے، جہاں سے کنیا کُماری کے درشن ہو سکتے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد وہ چاروں اس دوار پر پہنچے جہاں پجاری سب کو آگے سرکنے کے لیے کہے جا رہا تھا۔ سرجُو نے آنکھیں بند کر کے سیس نوایا اور آنند جو اس کے پیچھے کھڑا تھا دیر تک دیوی کی ناک میں چمکتے ہوئے ہیرے کو دیکھتا رہا، جس کی چمک نے صدیوں تک سمندری جہازوں میں سفر کرنے والوں کی آنکھوں کو چوندھیایا تھا اور جو کبھی کبھی سمندر کی لہروں میں اپنی دِشائیں بھی بھول گئے تھے۔

جب وہ مندر سے باہر آ کر سمندر کے کنارے کی ریت پر پہنچے تو سُورج کے غروب ہونے میں تھوڑا ہی سمے باقی تھا۔ لوگ ٹرکوں اور بسوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے اور ساتھ ہی عمارتوں کی دیواروں پر کھڑے تھے۔ ریت پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ سرجُو نے کیمرہ نکال کر ڈوبتے سُورج کی تصویریں لینے کے لیے کیمرہ فوکس کیا تو جانے کہاں سے بادل کے ٹکڑے سُورج کے قریب آ گئے اور اُسے ڈھک لیا۔ بادل کے بڑے سے ٹکڑے کی ذرا سی جھری میں سے ڈوبتا سُورج سمندر کے کنارے کھڑی اتنی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔

"کوالم کا سن سیٹ اس سے کہیں اچھا تھا۔" سرجُو نے کہا اور اپنا فوکس کیا ہوا کیمرہ نیچے کر لیا۔
"لے لو ایک تصویر۔" آنند نے کہا۔
"اچھی تصویر کے بعد خراب تصویر لینا بیکار ہے۔" سرجُو نے کیمرہ بند کر دیا۔

"تو تم کامپرومائزز میں بیلیو نہیں کرتیں ؟"

"نہیں آنند صاحب "

"اور ایڈجسٹمینٹس میں ؟"

"وہ بھی کم "

"زندگی کا کتنا تجربہ ہے تمھیں ؟"

"بہت کم "

"زندگی کا تجربہ ہو جائے تو بتانا "

"لیٹ اس سی "

سرجُو سے پھر اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے بلجندر، دلجیت اور آنند کی تصویریں تو لیں لیکن ڈوبتے سورج کی ایک بھی تصویر نہ کھینچی اُس نے۔ اس کے من پر بیکار کا بوجھ بنا رہا۔

پھر چاروں بازار میں گھومتے رہے۔ آنند تو صرف ان کا ساتھ دیتا رہا اور تینوں لڑکیاں، شنکھ، سیپیاں، سیپوں سے بنے ڈیکوریشن پیس اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدتی رہیں اور وہاں گھومتے گھامتے ساڑھے سات بج گئے۔ وقت زیادہ ہو گیا تھا اس لیے آنند نے ٹیکسی میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ آٹھ بجے کنیا کماری سے مدراس ٹرین جا رہی تھی وہ سب اس سے جا سکتے تھے۔ اسٹیشن کا پہلا حصہ بڑا خوبصورت تھا۔ پلیٹ فارم اس سے بہت آگے تھا۔ دونوں طرف لگے پیڑوں کے درمیان ایک سڑک تھی جو اسٹیشن کے پہلے پر وقار حصے کو پلیٹ فارم والے حصوں سے ملاتی تھی۔ وہ ابھی ڈبے میں بیٹھے ہی تھے کہ ٹرین چل پڑی۔ تینوں لڑکیاں بہت تھک گئیں تھیں۔ کچھ دیر تک تو بات چیت کرتی رہیں پھر وہ اپنی اپنی سیٹ سے پیٹھ ٹیک کر سو گئیں۔

آنند ویویکانندراک سے خریدی ہوئی کتابوں کے صفحے اُلٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اونگھ گیا۔

جب ٹرین تڑی وینڈرم پہنچی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ آنند نے ٹیکسی میں تینوں لڑکیوں کو سرسوتی لاج میں چھوڑا اور خود ایم ایل اے ہاسپٹل چلا گیا۔ وہ لڑکیاں بھی بھوکی ہی سوئیں اور آنند بھی بھوکا رہا۔ البتہ اس نے وسکی کا ایک بڑا لیا اور پھر سوگیا۔

میتھیو جارج نے سب کی اگلے دن کی ریزرویشن کروادی تھی۔ تینوں لڑکیوں کو دہلی جانا تھا کیرلا ایکسپریس سے اور آنند کو تڑی وینڈرم میل سے مدراس جانا تھا۔ دونوں گاڑیاں ایک بجے دوپہر کو چھوٹتی تھیں۔ گاڑیاں چلنے سے پہلے ریلوے اسٹیشن پر وہ تینوں لڑکیوں کو بائی بائی کہہ سکتا تھا۔

یہی کیا آنند نے اگلے روز۔

پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ وہ اگلی صبح سرسوتی لاج جائے گا اور ناشتہ بلجندر، دلجیت اور سرجیت کے سنگ کرے گا۔ اور پھر نو بجے تک وہ لوگ پدمانابھم مندر چلے جائیں گے اور اس کے بعد آنند اپنے دوستوں سے ملنے چلا جائے گا اور پھر ساڑھے بارہ بجے وہ ریلوے اسٹیشن پر ہی ملیں گے۔

اگلی صبح آنند ٹھیک آٹھ بجے سرسوتی لاج پہنچ گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد چاروں پدمانابھم مندر چلے گئے۔ وہی کنیا کماری والا قصہ۔ وہاں کم سے کم پتلون تو نہیں اتارنی پڑی تھی آنند کو، یہاں تو اسے پتلون اتار کر کرائے پر سفید دھوتی لینی پڑی اور پھر لڑکیوں کے سنگ جو ساڑھیاں پہن کر آئی تھیں مندر گیا۔

یہ مندر اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وشنو کی اتنی بڑی مورتی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مورتی تین جگہوں سے دیکھی جا سکتی تھی۔ پہلی جگہ سے شیش ناگ کے پھن کی چھاؤں میں لیٹے بھگوان وشنو کا بازو اور ہاتھ کی انگلیاں نظر آتی تھیں۔ دوسری جگہ سے درمیان کا دھڑ اور آخر میں بھگوان کی ٹانگیں۔ کالے پتھر کی اتنی بڑی مورتی دیکھ کر آنند کو یہ احساس ہوا کہ اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہتا اور کپڑے اتار کر مندر کے اندر نہ آتا تو وہ ایک بہت بڑی فنی معراج کو دیکھنے سے محروم رہ جاتا۔

وہ مندر کے بہت ہی وسیع حصّے میں گھوم کر اس کے گوپرم میں آگیا اور وہاں سے اس نے پدمانابھم مندر کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایک کتاب خریدی۔ اس کتاب کو وہ چنڈی گڑھ جاکر ہی پڑھے گا اور اس بات کی تصدیق کرے گا کہ مندر کا جو اتہاس اسے معلوم پڑا تھا وہ کس حد تک ٹھیک تھا۔

مندر سے باہر نکل کر جب وہ کرائے کی دھوتی واپس کر کے اور کپڑے پہن کر مندر کی سیڑھیاں اترنے لگا تو سرجُو نے کہا کہ وہ انھیں اس مندر کا اتہاس بتائے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہی اس نے پدمانابھم مندر کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم تھا بتایا۔

"اس سے زیادہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں نے کتاب خرید لی ہے چنڈی گڑھ جاکر پڑھوں گا۔"

"یہ آپ نے کسی سے پوچھا تھا کہ ٹراونکور کے موجودہ راجا بالارمن نے شادی کیوں نہیں کی؟" سرجُو نے سوال کیا۔

"میں نے اس کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔"

"ہو سکتا ہے محبّت میں چوٹ کھائی ہو اس نے کہیں۔" بلجندر نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" دلجیت نے کہا۔

"کسی لڑکی نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی ہو۔"

"آرٹ گیلری میں راجا کی تصویر تو بہت خوبصورت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی لڑکی نے اس کی طرف توجہ نہ کی ہو۔"

"میں تو راجا سے ہی پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔ آج کل وہ مدراس گیا ہوا ہے یہاں نہیں۔ میں بھی مدراس جا رہا ہوں آج۔ وہیں ملوں گا اس سے۔"

"تو آپ ہمارے ساتھ چنڈی گڑھ نہیں جا رہے؟"

سرجُو نے اس کے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم نے تو اپنے ٹکٹ آپ کی وجہ سے کینسل کرائے تھے۔" بلجندر بولی۔

"ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔"

"یہ تو غلط بات ہے۔"

"مجھے اپنے پیپر کے سلسلے میں ہی مدراس جانا ہے۔ آئی ہوپ یو انڈرسٹینڈ می۔"

"یو ہیو بیٹریڈ اَس آنند صاحب۔" سرجو نے کہا۔

"سوری فار دیٹ۔ آئی شیل کامپین سیٹ آفٹر ریچنگ چنڈی گڑھ۔"

"آل رائٹ۔" سرجو نے کہ تو دیا لیکن اس کا من ایکدم اداس ہو گیا۔

اور پھر آنند اُن سے الگ ہو کر اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے میتھیو جارج کے ساتھ وہ ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ اُسی سمے تینوں لڑکیاں قلی سے سامان اٹھوائے پہنچ گئیں۔

آنند نے انھیں کیرلا ایکسپریس کے کمپارٹمنٹ میں چڑھایا۔ تینوں نے آنند سے ہاتھ ملایا اور اس نے دیکھا سرجو کی پلکیں گیلی ہو گئی تھیں۔

میتھیو اس کا سامان لے کر پلیٹ فارم پر چلا گیا جہاں ٹری وینڈرم میل کھڑی تھی۔

دونوں ٹرینیں ایک ہی سمے پر چلیں۔

ایک دہلی کی طرف۔

دوسری مدراس کی طرف۔

آنند سے یہ کسی کو بھی پوچھنا یاد نہ رہا کہ وہ چنڈی گڑھ کب پہنچ رہا ہے۔

سرجو

آنند مدراس سے واپسی پر ایک دن دہلی رک گیا۔ اس لیے چنڈی گڑھ پہنچنے میں اسے ایک دن اور لگ گیا۔

جب اس نے کال بیل بجائی، تو اس کے لینڈ لارڈ کی بیوی مسز ورما نے دروازہ کھولا۔

"میں نے تو سوچا تھا اب تم کیرلا ہی میں سیٹل ہو جاؤ گے۔"

"پرولوبھن تو بہت تھا لیکن۔۔"

"لیکن چنڈی گڑھ کا اٹریکشن زیادہ تھا۔"

"ہاں مسز ورما۔"

"میں نے تمھارا فلیٹ صاف کرا دیا تھا۔ ڈرائینگ روم اور تمھارا رائیٹنگ ٹیبل سب ٹھیک کر دیے تھے۔"

"بہت بہت شکریہ مسز ورما۔ آپ کے سہارے ہی تو دن کٹ رہے ہیں چنڈی گڑھ میں۔

"مسکا مت لگاؤ۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مگر تمھارا بیڈ روم تو بے حد شیبی ہے۔ ہاؤ ڈو یو مینج اِٹ؟"

"میں مینیج کرتا ہی کہاں ہوں۔"

"کرنا چاہیے۔"

"آئی شیل بی کیئر فل اِن فیوچر، مسز ورما۔"

"یو آل ویز فارگیٹ،" لمحہ بھر رک کر اس نے کہا۔ "ایک لڑکی پرسوں سے کئی دفعہ تمھیں پوچھنے آئی تھی۔"

"کون تھی؟"

"ایک ہو تو حساب رکھوں۔ جانے کہاں کہاں سے پکڑ لاتے ہو لڑکیاں، ہر روز۔"

آنند نے جب کوئی جواب نہ دیا تو وہ پھر بولی۔

"ورما صاحب مجھے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ تمھیں مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دوں۔"

"کیوں؟"

"ہی ڈز ناٹ لائک یور ہیبٹس"

"وٹ اباوٹ، یو، مسز ورما؟"

"آئی لائک یو۔ اینڈ دیٹ از مائی پروبلم۔"

آنند، مسز ورما کا جواب سن کر زور سے ہنسا پھر اس نے کہا۔

"بہت زیادہ تھکا تو نہیں ہوں سفر میں۔ لیکن پھر بھی گھر میں آکر بیٹھنے کو من کرنے لگا ہے۔ پیاس بھی بہت لگ رہی ہے۔"

"آئی ایم سوری آنند، پلیز سِٹ۔ پانی لاتی ہوں تمھارے لیے۔ او گاڈ، کتنا پریشان کرتے ہو تم!"

آنند کرسی پر بیٹھ گیا اور مسز ورما ڈائیننگ روم میں چلی گئی۔

اس کا سامان باہر، اس کے فلیٹ کو جانے والی سیڑھیوں کے سامنے پڑا تھا اور وہ اپنے لینڈ لارڈ کے ڈرائینگ روم میں، اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی

سے فلرٹ کر رہا تھا۔ مسز ورما جب کمرے سے باہر چلی گئی تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ تین برس پہلے جب وہ ٹو لیٹ کا بورڈ دیکھ کر اس مکان کے اندر آیا تھا تو اس کی ملاقات مسٹر ورما سے ہوئی تھی۔

"اوپر والا فلیٹ خالی ہے کیا؟"

"خالی ہے۔"

"میں اسے کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔"

"بہت سے لوگ پہلے بھی آ چکے ہیں۔ ان کے نام اور پتے رجسٹر میں درج ہیں۔ آپ بھی رجسٹر میں اینٹری کر دیجیے۔"

"یہ کیوں؟"

"ہمارا یہی دستور ہے۔"

"تو کیا ان سب کے ناموں کی پرچیاں نکالیں گے؟"

"کچھ اسی قسم کا پروسیس ہوگا۔"

جب آنند نے رجسٹر میں بنائے کئی کالم بھر دیئے تو اس نے دیکھا کہ اس کا نام سولھویں نمبر پر تھا۔ پھر مسٹر ورما نے اسے ٹائپ شدہ ایک کاغذ دے دیا جس پر فلیٹ کرائے پر لینے کی کئی شرطیں درج تھیں۔ آخری شرط یہ تھی کہ جس روز مسز ورما کرائے دار کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دیں گی، اُسے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر فلیٹ خالی کرنا ہوگا۔ آخری شرط پڑھ کر آنند مسکرا دیا تھا۔

"تو آپ کا کرایہ دار مسز ورما کے رحم و کرم پر ہوگا۔"

"جی ہاں۔ میں خود ان کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"کیا میں مسز ورما سے مل سکتا ہوں؟"

"اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں۔ بیوٹی پارلر گئی ہوئی ہیں۔"

"کب تک لوٹیں گی؟"

"جب ان کا کام ختم ہو جائے گا۔"

اور لنچ؟"

"لنچ مجھے ہی تیار کرنا ہے۔"

آنند مسکرا دیا۔ پھر اس نے کہا۔

"مجھے شرط نامے کی ہر شرط منظور ہے۔ اگر چاہیں تو ایک مہینے کا ایڈوانس کرایہ بھی دے سکتا ہوں۔"

ایڈوانس کرایہ بیشک دے دیں۔ لیکن اس بات کی گارنٹی نہیں کہ فلیٹ آپ کو ہی کرایے پر ملے گا۔"

"مجھے نہ کسی گارنٹی کی ضرورت ہے نہ کرائے کی رسید کی۔"

اس نے کرایے کی رقم مسٹر ورما کے ہاتھ میں دے دی۔

آپ دو دن کے بعد آکر معلوم کریں؟"

"کل کیوں نہیں؟"

"ہمارا یہی طریقہ ہے۔"

آنند مسکرا دیا اور مسٹر ورما سے ہاتھ ملا کر واپس جانے ہی کو تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی خوبصورت نین نقش والی عورت، تھری وہیلر سے اُتری۔ بیوٹی پارلر سے ابھی ابھی لوٹی تھی وہ۔ اس لیے وہ اور بھی دلکش اور گریس فل لگ رہی تھی۔ آنند گیٹ پر ہی رُک گیا۔

"فلیٹ کے لیے آئے تھے؟"

"جی۔"

"ورما صاحب سے مل لیے؟"

"جی۔"

"شرطیں پڑھ لیں؟"

"جی۔"

"منظور ہیں؟"

"جی۔"

"آخری والی شرط بھی۔"

"جی۔"

"آپ صرف 'جی' ہی کہتے ہیں 'نہ' کبھی نہیں کہتے؟"

"جی۔"

بہت کھل کر ہنسی تھی مسز ورما۔ اس کے بدن سے بیوٹی پالر سے بٹوری خوشبوئیں بھی فضا میں بکھر رہی تھیں۔

"رجسٹر میں نام اینٹر کر دیا ہے؟"

"جی۔"

"ایڈوانس بھی دے دیا ہے؟"

"جی۔"

"فلیٹ کی چابی لے لی ہے؟"

"نہیں۔"

اب کی مسز ورما اور بھی زور سے ہنسی تھی۔

"چلیے آپ نے کسی بات کا جواب تو 'نہیں' میں دیا۔ آیئے چابی لے لیجیے۔"

"میرا نمبر سولھواں ہے مسز ورما۔"

"میں نے پہلے پندرہ نمبر کاٹ دیے ہیں۔"

"تھینک یو ویری مچ۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"فری لانسنگ۔"

"وٹ از یور فیلڈ؟"

"جرنلزم، مسز ورما۔"

"اے رسکی ایریا۔"

"یس۔"

"ویٹ فار اے منٹ۔" یہ کہ کر مسز ورما اندر چلی گئی اور آنند باہر فلیٹ کی سیڑھیوں کے پاس کھڑا رہا۔ پھر مسز ورما باہر آئی اور فلیٹ کی چابی آنند کو دیتے ہوئے بولی۔

"یو کین شفٹ ایون ٹوڈے۔ فلیٹ بالکل صاف ستھرا پڑا ہے۔"

"ایک آدھ دن میں شفٹ کروں گا، مسز ورما۔"

"پانی وانی تب پیجیے گا؟"

"جی۔"

مسز ورما نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک بار پھر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا، پل بھر اور جب مسز ورما پانی کا گلاس چھوٹی سی خوبصورت ٹرے میں لے کر آئی تو وہ اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔ کمرے کے ملگجے ملگجے اُجالے نے اسے اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا۔ مسٹر ورما اس سمے کچن میں تھا۔

سوچ کے اس موڑ پر جب پہنچا آنند، تو مسز ورما پانی کا گلاس اسی ٹرے میں لے کر داخل ہوئی ڈرائینگ روم میں۔ آنند کو لگا جیسے وہ ٹیلی ویژن پر کوئی سیریل دیکھ رہا تھا اور انٹرول کے بعد پھر پہلے والا سین ری پیٹ ہو گیا تھا۔ وہ مسکرایا۔

"وٹ اے کوانسی ڈینس!"

"کیا؟"

"کچھ نہیں مسز ورما۔" اس نے صوفے سے اُٹھ کر پانی کا گلاس لیا، تو مسز ورما نے بڑے پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ اور کمائی کر لائے ہو کیرالا سے؟"

"ہاں مسز ورما۔"

"تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے اور مسٹر ورما ایک دن تمہارا سارا سامان فلیٹ سے باہر پھینک دیں گے۔"

"لیکن ایگری مینٹ کی آخری شرط تو کچھ اور ہے۔"

"میں اسے تبدیل کر دوں گی۔"

"تو میں کورٹ میں چیلنج کر دوں گا۔"

"زیادہ سمارٹ ہو گئے ہو اب۔"

"اگر اپنے سے زیادہ عمر کی خوبصورت عورت مہربان ہو جائے تو آدمی بہت سمارٹ ہو جاتا ہے۔"

"تم ولگر بھی ہوتے جا رہے ہو۔"

"اس صورت میں ایسا بھی ہو جاتا ہے، مسز ورما۔"

"آئی شیل تھرو یو آوٹ۔"

"دِس از آلسو پاسی بل۔"

پھر وہ زور سے ہنسا اور اس نے مسز ورما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پشت کو چوم لیا۔

"لگتا ہے مجھے ایڈاپٹ کرنا پڑے گا، تمھارے جیسے فضول آدمی کو۔"

"میں اتنا خوش قسمت کہاں ہوں۔"

مسز ورما نے اسے کمرے سے باہر ڈھکیل سا دیا اور فلیٹ کی چابی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"جاؤ اب دفع ہو جاؤ اوپر۔ فرج میں بیئر کی دو بوتلیں لگا دی تھیں۔ پینا چاہو تو پی لینا۔"

"وٹ ایبا وٹ یو؟"

"کیپ ون فار می۔"

مسز ورما نے یہ کہہ کر ڈرائینگ روم کا دروازہ بند کر لیا اور آنند چابی کے چھلے کو انگلی میں گھماتے ہوئے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

مسز ورما نے اس کا فلیٹ واقعی صاف ستھرا کروا رکھا تھا۔ ڈرائینگ روم

کی ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔ بیڈ رُوم جو مسز ورما کے کہنے کے مطابق بے حد شبیہی تھا اس وقت تو ایک دم اپ ٹوڈیٹ دِکھ رہا تھا اس خاتون نے دُھلی ہوئی چادریں دونوں بیڈز پر بچھوادی تھیں۔ سارے میلے کپڑے دُھلوا دیے تھے۔ آنند کے پہننے کے کپڑے ہینگرز میں ٹنگے تھے۔ ایک بھی چیز ایسی نہ تھی جو کسی غلط جگہ پر پڑی ہو۔ ڈرائینگ ٹیبل پر رکھا سارا سامان بڑے قرینے سے پڑا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں جو ڈاک آئی تھی وہ الگ رکھی تھی۔ جو لوگ اسے ملنے آئے تھے پچھلے دس بارہ دنوں میں، اُن کے کارڈز ایک کونے میں رکھے تھے۔ ایک سرسری سی نگاہ خطوں اور میگزینز پر ڈالنے کے بعد آنند نے وزیٹرز کے کارڈز دیکھے۔ کوئی نیا شخص نہیں آیا تھا اسے ملنے اس کی غیر حاضری میں۔ تین چِٹیں سرجو کی تھیں جو پچھلے دو روز میں آتی رہی تھی۔ مسز ورما نے بھی شاید اُسی کے بارے میں کہا تھا کچھ دیر پہلے۔

پھر وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے گیا اور اپنا سامان اوپر فلیٹ میں لے آیا۔ مسز ورما اسے نہ بتاتی تو شاید اسے خیال بھی نہ آتا۔ لیکن اس کے ذکر کے بعد تو ناممکن تھا کہ آنند فرج کو نہ کھولے۔ اس نے فرج کھولا اور بیئر کی ایک بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ بیئر وہ ہمیشہ اسی طرح پیتا تھا۔ ایک دم کھُلی بوتل کو مُنہ سے لگا کر۔ بیئر پینے کے لیے گلاس کا استعمال نہیں کرتا تھا وہ۔ خالی بوتل ڈائیننگ ٹیبل پر رکھ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے نیند آگئی۔

اسے سوئے ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی کہ کال بیل بجی۔ صرف ایک ہی بار مسلسل اور نا بڑ توڑ نہیں۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے سرجو کھڑی تھی۔

"گڈ آفٹر نون۔" اس نے آنند کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور اندر آگئی۔

جانے کیوں آنند نے کوئی جواب دینے کی بجائے اُسے اپنی باہنوں میں لے لیا اور سرجو یوں سمٹ گئی، اس کی باہنوں میں، جیسے سمندر کی کوئی چھوٹی سی لہر کسی بڑی لہر میں مدغم ہو جاتی ہے۔

آنند اسے اپنے دائیں بازو کے گھیرے میں لیے ڈرائینگ روم میں لے آیا اور اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"کیسی ہو سرجوتم؟"

"جیسی سرجو کو ہونا چاہیے۔"

"ایکدم فریش، دلکش اور خوبصورت۔"

"آئی ڈاونٹ نو۔"

"تمھاری دوست کیسی ہیں؟" وہ خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا، سرجو کے پاس۔

"دونوں اچھی ہیں۔"

"آئیں نہیں تمھارے ساتھ؟"

"دو دن سے ملیں نہیں۔ کل یا پرسوں لے کر آؤں گی۔"

"تمھارا ڈیپارٹمنٹ ٹھیک چل رہا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا پیئوگی؟"

"جو آپ کہیں۔"

میں نے تو ابھی بیئر پی تھی، کچھ دیر پہلے۔"

"چنڈی گڑھ پہنچتے ہی پروگرام شروع کر دیا۔"

"میری لینڈ لیڈی نے فرج میں دو بوتلیں لگا رکھی تھیں۔ ایک میں نے پی لی۔"

"آپ کی لینڈ لیڈی بہت خیال رکھتی ہے آپ کا۔"

"کوئی تو ہونا چاہیے، جو خیال رکھے۔"

"وہ لیڈی ہے بہت کیوٹ۔"

"ہاں۔"

"میں آپ سے ملنے آئی تو پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں اور آپ کو کیسے

جانتی ہوں۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ آپ سے بڑی وینڈرم میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"جبھی کہہ رہی تھی کہ اس بار کیرلا سے کیا کمائی کر کے لایا ہوں۔"

آنند بہت زور سے ہنسا۔ "لیکن میرا سارا گھر ٹپ ٹاپ رکھا ہے میری غیر حاضری میں، اُس نے۔"

"وہ تو دکھ ہی رہا ہے۔"

"چائے بناؤں یا کافی؟"

"آپ بنائیں گے؟"

"اور کون بنائے گا؟"

"میں بھی تو بنا سکتی ہوں۔"

"بڑا جھنجھٹ ہوگا۔"

"کیوں؟"

"سب کچھ تلاش کرنا پڑے گا۔ چائے کی پتّی کہیں ہوگی تو شکر کہیں، اور دُودھ بھی پاوڈر سے بنانا ہوگا۔ پیالیاں ڈھونڈنی پڑیں گی۔"

"کچن تو نہیں ڈھونڈنا پڑے گا؟"

"نہیں۔" آنند زور سے ہنسا۔

"تو باقی میں سب دیکھ لوں گی، بس ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ ڈرائینگ رُوم ہی میں بیٹھے رہیں گے اور میرے اردگرد نہیں منڈلائیں گے۔"

"اور تم سب کچھ لُوٹ کر لے جاؤ اور میں صرف دیکھتا رہوں۔"

"لُٹنے کے بعد شور مچایئے بے شک۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سرجو بولی اور

صوفے سے اُٹھ کر جانے لگی۔ جبھی آنند نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
آنند نے جس نظر سے سرجو کو دیکھا، وہ نظر ایک ٹھنڈی لہر کی طرح اس کے بدن میں پھیل گئی۔ سرجو نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں۔ صرف اتنا کہا۔
"آپ کو چائے پسند ہے یا کافی؟"
"جو تم پلا دو۔"
یہ کہتے ہوئے جب آنند نے دھیرے سے اُسے اپنی طرف کھینچا تو سرجو اس کے سینے سے لگ گئی اور اُسے خیال آیا ان لمحوں کا جب کچھ ہی روز پہلے کنیا کماری کے مندر میں درشکوں کی بھیڑ کے درمیان، اُس نے اپنے پیچھے کھڑے آنند کی ننگی چھاتی کو دیکھا تھا تو اُس کے جسم میں ایک کپکپی سی رینگ گئی تھی۔ اس نے فوراً نظر ہٹا لی تھی اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا تھا کیونکہ اس نے پاپ کیا تھا۔ دیوی کے مندر میں کسی پرُش کو بُری درِشٹی سے دیکھا تھا اُس نے۔ پھر اُس نے پوچھا
"آپ کو یاد ہے؟"
"کیا؟"
"کنیا کماری کے درشنوں کے لیے درشکوں کی لمبی قطار۔"
"اور اس میں تین لڑکیوں کے پیچھے کھڑا ایک پاپی۔"
"اور اس کے آگے کھڑی ایک پاپن۔"
"جس نے اس پاپی پرُش کے ننگے بدن کو بڑی واسنا کی درِشٹی سے دیکھا تھا۔"
"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"
"اس وقت تو شاید جھوٹ بول دیتا لیکن اب سچ بول رہا ہوں۔"
"آپ اپنے کو راجا ہریش چندر سمجھتے ہیں؟"
"بالکل نہیں۔ میں اتنا کٹھور نہیں ہوں کہ اپنے بیٹے کی لاش کو چِتا پر رکھنے کے

لیے بھی شرطیں لگاؤں۔"

"لیکن آپ کا بیٹا ہے کہاں؟"

"جگت کے جتنے بیٹے ہیں وہ سب اپنے ہی بیٹے ہیں۔"

آنند بہت زور سے ہنسا اور اس دوران سرجو اس کے سینے سے الگ ہوگئی اور اس کا ہاتھ بھی آنند کے ہاتھ سے خود بخود ہی چھوٹ گیا۔

سرجو کچن میں چلی گئی اور آنند ڈرائینگ روم میں ٹہلنے لگا۔

پھر سرجو اور آنند دونوں چائے پینے لگے اور چائے پیتے ہوئے سرجو نے پوچھا۔

"آپ کا پیپر کب نکل رہا ہے؟"

"پہلا ایشو سات فروری کو نکالنا چاہتا ہوں۔"

"سات فروری کی کیا امپارٹینس ہے؟"

"میرا جنم دن ہے اس روز۔"

"آئی سی۔"

"کچھ برسوں تک یہ تاریخ بہت امپارٹینٹ تھی۔"

"آپ کے لیے نا؟"

"نہیں گنگا کے لیے۔"

"یہ گنگا کون تھی؟"

"ایک ندی۔"

"سرجو کی طرح؟"

"نہیں کسی کی طرح نہیں۔ ایک دم اپنی طرح۔"

"تو کچھ برسوں کے بعد کیا ہوا؟"

"بہت پولیوشن ہوگیا، گنگا میں۔"

"وہ کیسے؟"

"اُس کا جل گدلا ہونے لگا تھا۔ میل بھرتے لگا تھا اُس میں۔"
"سمجھی نہیں۔"
"پیار ہی گنگا کا جل ہے سرجو! جب پیار میں شک اور شنکاؤں کی مٹی گھُلنے لگے تو جل گدلا ہونے لگتا ہے۔ اور اگر اس کی صفائی نہ کی جائے تو وہ مٹی دلدل بننے لگتی ہے اور گنگا ایک ندی نہ رہ کر دلدل کا ایک لمبا چوڑا پھیلاؤ بن جاتی ہے۔ بس پھر گنگا مر جاتی ہے اور اس کے کناروں پر پولیوشن کی تہیں جمنے لگتی ہیں۔ اور پیار کی خوشبو کی جگہ سڑاند نکلنے لگتی ہے۔ مُردہ جانوروں کی نعشوں سے نکلتا ہوا تعفن۔"
"یہ حالت تو کسی بھی ندی کی ہو سکتی ہے۔"
"ضرور ہو سکتی ہے۔"
"تو پھر صرف گنگا کو دوشی کیوں ٹھہرایا جائے؟"
"کیونکہ اس سمے جس ندی کا جل مجھے سیراب کر رہا تھا وہ گنگا ہی تھی۔ کتنا سیراب کیا تھا اس نے مجھے، تم اندازہ نہیں کر سکتیں سرجو۔ میرا رُوم رُوم اُس نے ڈُبو دیا تھا اپنے ٹھنڈے شیتل جل میں اور جب سوکھی تھی تو ایسے جیسے کوئی جلتا ہوا اسیم صحرا اُسے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا ہو۔"
"بات تو آپ کے جنم دن کی ہو رہی تھی۔"
مجھ سے میرے جنم دن کی زیادہ فکر گنگا کو رہتی تھی۔ وہ تو مہینہ بھر پہلے مجھے سات فروری کی تاریخ یاد دلانا شروع کر دیتی تھی۔ اُس روز صبح سویرے نہا کر مندر جاتی تھی، پرساد لے کر آتی تھی اور میں ابھی سویا ہوتا تھا جب وہ پرساد میرے سرہانے رکھ دیتی تھی اور کہتی ___ جتنے ناستک تم ہو، اتنا تو شاید بھگوان بھی نہیں ___ میں کہتا۔
___ یہ ناستکتا ہی ایک دن چھنوا دے گی مجھے تم سے۔
اور پھر وہ مندر سے کاغذ کے ٹکڑے میں رکھے، چندن کے لیپ کو اپنی

انگلی سے میرے ماتھے پر لگا دیتی اور کہتی ـــــ نہانے کے بعد پرساد ضرور لے لینا۔
پھر وہ چائے بنا کر میرے بستر کے سامنے چھوٹی سی تپائی پر رکھتی۔ اُس میں سے ایک گھونٹ مجھے پلاتی اور پھر جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کرکے، اپنے گیلے بالوں کی مہک کمرے میں بکھراتے ہوئے دروازے سے باہر چلی جاتی۔
جانے سے پہلے دروازے پر پل بھر کر رُک کر کہتی
شام کو ٹھیک پانچ بجے گھر لوٹ آنا۔ اور کسی کو ساتھ مت گھسیٹ لانا۔ جنم دن اکیلے میں منتا ہے، بھیڑ میں نہیں۔
"گنگا کے لُپت ہو جانے کے بعد میں اپنا جنم دن اکیلے ہی مناتا ہوں۔ اپنے آپ کو سب سے کاٹ کر، اپنے گھر میں خاموش کمرے میں!"
"کس طرح مناتے ہیں آپ اپنا جنم دن؟"
"بس ایک بڑی سی موم بتی جلاتا ہوں۔ اتنی بڑی کہ آدھی رات کے بعد تک جل سکے اس لیے کہ میرا جنم آدھی رات کے بعد ہوا تھا۔"
"اور کیا کرتے ہیں؟"
"شراب پیتا ہوں اور سارے سال کا حساب کرتا ہوں بیٹھ کر۔ کیا کچھ کھویا میں نے اس سال۔"
"صرف کھونے کا حساب کرتے ہیں؟"
"ہاں سرجُو، میرے نزدیک زندگی کھوتے رہنے کا ہی ایک لگاتار پروسیس ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"ہم اپنی عمر کھوتے ہیں۔ ماضی کھوتے ہیں ہم اپنا۔ اپنے خواب کھوتے ہیں ہم۔ اپنی سانسوں کا نقصان کرتے ہیں۔ ہمارا ہر بڑھتا دن ہم سے عمر کا ایک ایک قیمتی سال چھینتا رہتا ہے اور ہم اس پر خوش ہوتے ہیں۔ ہماری عمر کا گھٹتا ہوا ہر سال ہمیں موت کے قریب کرتا جاتا ہے۔ اپنی سال گرہیں مناکر دراصل ہم اپنی زندگیوں کا ماتم کرتے

ہیں سرجو۔ ماتم میں کیونکہ دوسروں کی شرکت ضروری ہے شاید اسی لیے ہم اپنے جنم دن بھیڑ میں مناتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا!" آنند بہت زور سے ہنسا اپنی بات پر۔

"کیا زندگی نے آپ کو کچھ بھی نہیں دیا ہے؟"

"جتنا دیا، اس سے زیادہ وصول کر لیا، سود سمیت۔ زندگی سب سے بڑی سود خور ساہوکار ہے۔ وہ پائی پائی کا حساب رکھتی ہے اور بڑی سنگدلی سے وصول بھی کرتی ہے۔"

"آپ نے کچھ روز پہلے ہی تو پوچھا تھا۔ تمھیں زندگی کا کتنا تجربہ ہے؟"

"تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

"یہی کہ زیادہ تجربہ نہیں۔"

"سرجو یہ سب تجربوں سے ہی سیکھا ہے میں نے۔ مجھے جب کوئی پہلی بار بڑی محبت سے ملتا ہے تو میں اس کے ماتھے پر لکھی وہ تحریر پڑھتا ہوں جس میں اس وکتی کے الگ ہو جانے کی گھڑی درج ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے اور بھی زیادہ تپاک سے ملتا ہوں، اپنے نئے ملنے والے کو۔ آخر اسے جلدی الگ بھی تو ہونا ہے مجھ سے۔" آنند اور بھی زور سے ہنسا اور پھر اس نے سگریٹ سلگا کر، سارا دھواں کمرے میں بکھیر دیا۔

"اسی لیے آپ مجھ سے بھی اتنے پیار سے ملے تھے؟"

"شاید اسی لیے۔"

"آپ کو معلوم ہے میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

"مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

"کیا لکھا ہے آپ کی قسمت میں؟"

"فی الحال، تم۔"

یہ سن کر سرجو کے رگ رگ میں کپکپی سی پھیل گئی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ تمھارے ماتھے پر جو لکھا ہے وہی پڑھ رہا ہوں۔"

سرجو نے آنند کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اپنا ایک بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور کہا۔

"اور کیا لکھا ہے میرے ماتھے پر؟"

"لکھاوٹ بہت مہین ہے۔ میرے پاس لینز نہیں، جس کی مدد سے اسے پڑھ سکوں۔" سرجو نے اپنا دوسرا بازو بھی اس کے گلے میں ڈال دیا اور اپنا ماتھا اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"اب پڑھیے میرے ماتھے پر لکھی میری تقدیر۔!"

آنند نے اُسے اپنی باہوں میں لے لیا اور کہنے لگا۔

"تم میرے فورٹ نائٹلی "ویژن" کی اسسٹنٹ اڈیٹر ہوگی۔ اخبار کا پہلا اِیشو بڑی شان سے سات فروری کو ریلیز ہوگا۔ اس میں راشٹرپتی اور پرائم منسٹر سے لے کر سبھی امپارٹینٹ لوگوں کے پیغام ہوں گے۔ تمھیں بھی اُس دن بہت لوگ مبارک دیں گے اور اُسی دن سے تمھارے مخالف ستارے گردش میں آنے شروع ہو جائیں گے۔

اس شام کے فنکشن کی بھیڑ بھاڑ کے بعد تم میرے ساتھ میرے فلیٹ میں آ جاؤ گی اور ایک کی جگہ دو بڑی بڑی موم بتیاں جلاؤ گی۔ میں جب گزرے ہوئے سال کا حساب کرنے بیٹھوں گا تو تم مجھے اکیلے شراب نہیں پینے دو گی۔ ایک گلاس میں اپنے لیے بھی تھوڑی سی وسکی ڈال لو گی اور اسے دھیرے دھیرے پیتی رہو گی۔

میرے اس برتھ ڈے پر، میں تو نہیں لیکن تم کیک کاٹو گی اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا میرے مُنہ میں ڈال کر، باقی حصّہ اپنے مُنہ میں ڈال لو گی۔

اس رات جب تم گھر لوٹو گی تو تمھارے پیچھے پیچھے تمھارے مخالف ستاروں کے دُوت ہوں گے جو تمھیں گھر کے دروازے پر چھوڑ کر رات بھر وہیں بیٹھے رہیں گے کہ تم جس روشنی کو دل میں لے کر آئی ہو، اس میں تھوڑا تھوڑا اندھیرا گھولتے

رہیں، صبح تک!
تمھیں بہت کیش ملے گا۔ تمھارا سوشل سرکل بھی بہت بڑھ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی تمھارے سکینڈل شروع ہو جائیں گے!"
"پھر کیا ہوگا؟" سرجو نے بڑی گمبھیرتا سے پوچھا۔
"پھر میرا اخبار فیل ہو جائے گا اور تم مجھ سے الگ ہو جاؤ گی!"
"ایسا نہیں ہوگا" سرجو نے اپنا ہاتھ آنند کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔
"ایسا ہی ہوگا، ڈیر سرجو شرما۔ تمھارے ماتھے پر ایسا ہی لکھا ہے!"
"غلط لکھا ہے!" وہ غصے سے بولی۔
"ماتھے پر کچھ بھی غلط نہیں لکھا ہوتا۔ اخباروں میں غلط لکھا ہوتا ہے اور اسی لیے اخبار فیل ہو جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی تحریریں فیل نہیں ہوتیں۔ اخباروں، میگزینوں اور کتابوں کی تحریریں فیل ہوتی ہیں!"
تپائی پر رکھی پیالیوں میں بچی ہوئی چائے ٹھنڈی ہوتی رہی اور آنند سرجو کے ماتھے پر کی تحریریں پڑھنے میں لگا رہا
"اور چائے بناؤں؟"
"نہیں!"
سرجو چائے کے برتن کچن میں رکھ کر واپس ڈرائینگ روم میں آگئی۔
"اب میں جاؤں؟"
"جاؤ!"
اور پھر آنند فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر سرجو کو گیٹ تک چھوڑنے گیا۔ کلاسز ختم ہونے کے بعد اگلے دن وہ آنند سے ملنے آئے گی، یہ کہ کر سرجو چلی گئی۔ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا آنند تو مسز ورما کے کمرے کا دروازہ کھلا۔
"بیئر پی لی تم نے؟"
"کب کی پی چکا!"

"آپ کے لیے لاؤں دوسری بوتل؟"

"نہیں تمہارے فلیٹ میں آکر ہی پیوں گی۔ یہاں تو ورما صاحب کچھ کچھ کریں گے۔"

"تو ٹھیک ہے۔"

"یہی لڑکی ملی تھی تمہیں ٹری وینڈرم میں؟"

"کون سی لڑکی؟"

"جو ابھی ابھی تم سے مل کر گئی ہے۔"

"جی۔"

"کیا کرنے آئی تھی؟"

"میرے اخبار میں کام کرنے کے لیے۔"

"تو اب تم اخبار نکال رہے ہو؟"

"جی۔"

"فری لانسنگ ختم کر دو گے؟"

"ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔"

"فری لانسنگ تم کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔"

"کیوں؟"

"تمہارے ماتھے پر لکھا ہے۔"

"تو آپ ماتھے کی تحریریں بھی پڑھ لیتی ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے، تم اس لڑکی کی تقدیر نہیں پڑھ رہے تھے کیا، اُسے صوفے پر اپنے ساتھ چمٹا کر؟"

"میری نظر کمزور ہے اس لیے اس کے ماتھے کو آنکھوں کے نزدیک کر لیا تھا مسز ورما۔"

"تم بہت گھٹیا آدمی ہو۔"

"اس کے باوجود میں دوسروں کے کمروں میں نہیں جھانکتا۔"

"بہت بیکار آدمی ہو تم لیکن ـــــــ"

"لیکن آپ کو پسند ہوں۔"

"دیٹ از دی پرابلم۔"

"آیئے گا کسی وقت بیئر پینے۔ میں نے اور بوتلیں بھی فرج میں رکھ دی ہیں۔"

"آئی شیل کم۔"

آنند مسز ورما کو دیو کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"ویژن" کا پہلا ایشو نکالنے کے لیے بہت سے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے۔ آنند کے ایک آرٹسٹ دوست نے "ویژن" کی ڈمی بنا دی تھی۔ پرنٹنگ پریس کا انتظام ہو گیا تھا۔ پریس والے کو اس نے کچھ ایڈوانس رقم بھی دے دی تھی۔ کاغذ کا کوٹا مل گیا تھا۔ پانچ سو کے قریب گاہکوں کا سال بھر کا چندہ بھی آگیا تھا۔ کچھ بڑے بڑے کارخانہ داروں نے اخبار کے لیے اشتہار بھی دے دیئے تھے۔ آنند کو ہر فیلڈ سے لکھنے والوں کا تعاون مل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ "ویژن" کامیاب رہے گا اور اب وہ شاید اس قابل ہو سکے کہ فری لانسنگ چھوڑ دے۔"

سرجو ہر روز تین بجے کے بعد دو تین گھنٹوں کے لیے آجاتی تھی۔ آنند نے "ویژن" کے لیے نیا دفتر کرایے پر نہیں لیا تھا۔ اپنے ڈرائینگ روم میں ہی کچھ ایڈجسٹمینٹس کر کے اسے اپنا دفتر بنا لیا تھا۔ اب اس کا بیڈ روم ہی ڈرائینگ روم بھی بن گیا تھا۔ سرجو نے مختلف رنگوں میں اخبار سے متعلق مختلف فائل ترتیب سے رکھ دیئے تھے۔ "ویژن" کے پیڈ اور دوسرے کاغذوں میں سرجو کا نام بطور اسسٹنٹ اڈیٹر چھپ گیا تھا۔ بہت سی ڈاک اسی کے دستخطوں سے جاتی تھی۔ ایک پارٹ ٹائم ٹائپسٹ اور چپراسی بھی رکھ لیا تھا آنند نے اخبار کے لیے۔ ویسے سرجو خود بھی ٹائپ کر لیتی تھی۔ جرنلسٹ کے لیے ٹائپ جاننا بہت ضروری ہے، یہی کہا تھا آنند نے ایک دن اُسے

جب وہ ٹائپ رائیٹر پر کچھ ضروری لیٹرز ٹائپ کر رہا تھا، جنھیں شام کی ڈاک سے پوسٹ کرنا تھا۔

سرجو کے پوچھنے پر کہ ایک جرنلسٹ کے لئے کون سی باتیں ضروری تھیں، آنند نے کہا تھا۔

"ہی شُڈ ہیو اے سٹائل آف ہیز اون۔"

"کیسے؟"

"پڑھنے والا محسوس کرے کہ جو سٹوری سرجو شرما نے تیار کی ہے، وہ صرف وہی تیار کر سکتی تھی کوئی اور رپورٹر یا اسسٹنٹ اڈیٹر نہیں۔ لینگویج، جملوں کی بناوٹ، ان کی ترتیب، اختصار۔

"آخر میں یہ سب چیزیں کسی جرنلسٹ کی پہچان بن جاتی ہیں۔"

"جی۔"

"جرنلزم از این آرٹ۔ اس میں بھی بڑی تپسیا کی ضرورت ہے۔"

"ہارڈ ورک، یو مین؟"

"ناٹ اونلی دِس۔ ڈیڈی کیشن، کمٹمینٹ، اے سارٹ آف میڈنیس، جرنلزم آرٹ کے علاوہ ایک قسم کا پاگل پن بھی ہے۔" آنند ہنسا۔

"تو آپ مجھے پاگل بنانا چاہتے ہیں؟"

"میں نہیں چاہتا۔ یہ تو اس پروفیشن کا تقاضہ ہے۔"

"وٹ مور؟"

"بولڈنیس۔ پے شینس۔ اِنی شی ایٹو۔"

"او گاڈ۔ یُو وانٹ ٹو میٹا مارفوز می؟"

"ناٹ آئی سرجو۔ دی پروفیشن!" آنند ہنسا اور اس نے سرجو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بڑے پیار سے تھپتھپایا۔

"اب بھی سوچ لو۔ میٹر پریس میں جانے والا ہے۔ چاہو تو اپنا نام کاٹ دو۔"

"اب تو نہیں کاٹوں گی، آنند صاحب!"

"بعد میں بھلے ہی کٹ جائے!"

"اس وقت میں آپ ہی کی بات پر عمل کر رہی ہوں۔ فیوچر کے ڈیو کے ڈر سے اپنا پریزنٹ برباد کرنا نہیں چاہتی۔ آپ تو میرے ساتھ ہیں نا؟"

"ایٹ لیسٹ فار دی ٹائم بینگ!"

"وائی سو؟"

"میں تقدیریں پڑھنے والا آدمی ہوں، اس لیے!"

"تو آپ تقدیریں پڑھیے۔ میں کچھ ضروری لیٹرز ٹائپ کر لوں!"

سرجو ٹائپ رائٹر پر بیٹھ گئی اور آنند ٹیلی فون اُٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا تاکہ سرجو ڈسٹرب نہ ہو۔

آنند کا اپنے لینڈ لارڈ مسٹر ورما سے جھگڑا اُس روز ہوا جب اُس کی غیر حاضری میں آنند نے "ویژن" کا بورڈ اپنے فلیٹ کے باہر بالکونی پر لگوا دیا۔ شام کو مسٹر ورما جب سیر سے پاس آیا تو اخبار کا بورڈ دیکھ کر اسے بے حد غصہ آیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ کال بیل بجانے کی بجائے اس نے اپنی چھڑی سے دروازے پر کھٹکا کیا۔

"کون؟" آنند نے پوچھا۔

"ورما!"

"کون ورما؟"

"تمھارا لینڈ لارڈ!"

آنند نے دروازہ کھولا اور مسکرا کر اسے اندر آنے کے لیے کہا۔

"نہیں، میں اندر نہیں آؤں گا!"

"کیوں؟"

"میری مرضی!"

"کبھی تو کسی کی بھی مرضی چلنے دیجیے، ورما صاحب۔"
"تم نے تو پہلے ہی اپنی من مانی کر لی۔"
"کیا کیا ہے میں نے آخر؟"
"اخبار کا بورڈ کیوں لگوا دیا بالکونی کے باہر؟"
"اس لیے کہ میں اخبار نکالنے جا رہا ہوں۔"
"اِٹ اِز ناٹ اے کمرشل پلیس۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"تمھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انکم ٹیکس والے مجھے پریشان کریں گے۔"
"تو بتائیے میں کیا کروں اب؟"
"تم فلیٹ خالی کر دو۔"
"یا؟"
"یا، کچھ نہیں۔ یُو ویکیٹ دی فلیٹ۔"
"کب تک؟"
"چوبیس گھنٹوں کے اندر۔"
"یہ کیوں؟"
"ایگریمینٹ کے مطابق۔"
"مگر یہ تو اس حالت میں ہے جب مسز ورما فلیٹ خالی کرنے کو کہیں۔"
"مسز ورما نے ہی کہا ہے۔"
"تو میں ان سے پوچھ لیتا ہوں۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔ میں مسز ورما کے بی ہاف پر ہی بول رہا ہوں۔ مسز ورما میری وائف ہیں۔"
"مگر وہ میری بھی تو کچھ ہیں، ورما صاحب۔"
"وٹ ڈو یو مین!" مسٹر ورما بہت زور سے چیخا۔

"وہ میری لینڈ لیڈی ہیں۔ اور میں اُن کی بہت عزت کرتا ہوں۔"
"مجھے معلوم ہے، تم جتنی عزت کرتے ہو۔ چلو پوچھ لو مسز ورما سے۔"
مسٹر ورما یہ کہہ کر، اپنی چھڑی کو سیڑھیوں سے ٹکراتا ہوا نیچے اتر گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد کال بیل بجی۔
آنند نے دروازہ کھولا۔
"آپ، مسز ورما!"
"ہاں!"
"میں تو خود آرہا تھا آپ سے ملنے۔"
"تم نے ورما صاحب کی اِنسلٹ کی ہے۔"
"میری جرأت ہے بھلا؟"
"وہ بہت ناراض ہیں تم سے۔"
"فلیٹ خالی کرنے کو کہہ گئے ہیں۔"
"نیچے چلو۔ تم سے بات کرتی ہوں۔ یہ لے جاؤ اپنا "ویژن" کا سٹنٹ۔ صرف چھوکریوں کا چکر ہے تمھارا۔ میں سب جانتی ہوں۔" مسز ورما واقعی بہت ناراض لگ رہی تھی۔
"مگر آپ بیٹھے تو سہی۔"
"نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں۔ تم بھولی بھالی عورتوں کو ورغلاتے ہو۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"
"پہلے بیٹھنے کو کہو گے۔ پھر کہو گے ہیو اے سمال ڈرنک مسز ورما۔"
"نہیں، میں بالکل نہیں کہوں گا۔ مسز ورما!" آنند مسکرایا اور اس نے مسز ورما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چوم لیا۔ "آپ کے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں۔"
"جن کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں وہ لوگ بڑے وارم ہارٹڈ ہوتے ہیں، معلوم ہے تمھیں؟"

"نہیں مسز ورما"

"تم ایکدم ایڈیٹ ہو"

"یہ تو ٹھیک ہے، مگر آپ بیٹھیے تو سہی۔ نیچے چل کر جو جھگڑا ہوگا، میں اس کے لیے تیاری کر لوں"

"کیا تیاری کرو گے؟"

"ایک آدھ پیگ مار لوں" آنند زور سے ہنسا اور پھر لمحہ بھر کے لیے بیڈ رُوم میں چلا گیا۔ آج کل اس کا بیڈ روم ہی بوتنگ رُوم بن چکا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں مسز ورما اس کے ڈرائینگ روم کا جائزہ لیتی رہی۔ کیا بُرا حال بنا رکھا تھا اس نے کمرے کا۔ میز پر ایک کے اوپر ایک فائل رکھا تھا۔ ایک ڈھیر سا لگا تھا فائلوں کا اور کتابوں اور اخباروں کا، جو دیوار کے سہارے ٹکا تھا۔ میز کو کوئی ذرا سا ہلا دے اپنی جگہ سے اور پھر تماشا دیکھے۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر میز کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ آنند ساتھ کے کمرے سے آگیا۔

"کیا کر رہی ہیں؟"

"تمھارا کباڑ خانہ دیکھ رہی تھی"

"لیجیے۔ آپ بھی اپنے آپ کو جنگ کے لیے تیار کر لیں" اس نے وسکی کا گلاس مسز ورما کی طرف بڑھایا۔

"سمجھدار آدمی ہو"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ مجھے ایڈیٹ کہہ رہی تھیں"

"وہ تو تم ہو ہی"

پھر دونوں نے اپنے اپنے گلاسوں سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ اور آنند نے مسز ورما کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"مسز ورما، دراصل ہم سب کسی نہ کسی محاذ پر کوئی نہ کوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ سب اکیلے لڑی جانے والی جنگیں ہیں۔ ان جنگوں میں ہمارے ساتھ کوئی نہیں

ہوتا۔ کبھی یہ جنگ ہم اپنے آپ سے لڑتے ہیں۔ کبھی اپنے ماحول سے، کبھی اپنے ہی گھر کے لوگوں سے۔"

"اور کبھی اپنے ضمیر سے بھی۔" مسز ورما نے دوسرے گھونٹ میں آدھا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی آتما سے اور اپنے سنسکاروں سے، اور کیا۔۔۔؟"

"اور ان لوگوں سے جنھیں ہم پیار کرتے ہیں، مسز ورما۔"

"یس۔" اس نے اپنا گلاس ایکدم خالی کر دیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ سیڑھیوں پر رُکتے ہوئے اس نے کہا۔ "فوراً آجاؤ!"

"کمنگ مسز ورما۔"

مسٹر ورما سیڑھیوں کے سامنے کھڑا مسز ورما کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر اور کچھ لمحے وہ نہ آتی تو وہ خود اوپر کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ وہ کال بیل کم ہی استعمال کرتا تھا۔

آنند نے جلدی جلدی ایک پیگ اور لیا اور پھر سیڑھیاں اتر کر مسٹر ورما کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ لینڈ لارڈ اور لینڈ لیڈی دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آنند اس وقت خاصے موڈ میں تھا۔ مسز ورما کا موڈ بھی اچھا ہی لگ رہا تھا۔

"بیٹھو آنند۔" مسز ورما نے کہا۔

آنند صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور پھر ایک سگریٹ سلگا لیا اُس نے۔

"تم سگریٹ بہت پیتے ہو۔" مسٹر ورما کا کومینٹ تھا۔

"جی ہاں، عادت پڑ گئی ہے۔"

"بُری عادتیں چھوڑنے کی کوشش کرو، اگر تم اچھا آدمی بننا چاہتے ہو۔"

"زندہ رہنے کے لیے ایک نہ ایک بُری عادت بھی ہونی چاہیے، ورما صاحب۔"

"تو مرنے کے لیے کیا کرو گے؟"

"کوئی اچھی عادت ڈال لوں گا۔" وہ ہنسا۔

"ورما صاحب تم سے بہت ناراض ہیں۔" مسز ورما نے اسے مخاطب کیا۔
"آئی ایم سوری، مسز ورما۔ حالانکہ میں جانتا نہیں کہ وہ کیوں ناراض ہیں۔"
"جاننے کی کوشش کرو۔"
"آئی شیل ٹرائی۔"
"وٹ ٹرائی؟" مسٹر ورما چیخا۔ "یا تو صبح تک بالکونی سے بورڈ ہٹا دو یا فلیٹ خالی کر دو۔"
"آپ تو بہت جلدی غصے میں آجاتے ہیں۔ آنند بہت اچھا کرایہ دار ہے۔ کیوں آنند؟"
"جی ہاں مسز ورما، میں اچھا کرایہ دار ہوں۔"
"وٹ ڈو یو مین؟" مسٹر ورما چلایا۔
"بہت شاؤٹ کرتے ہیں آپ۔ ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو احتیاط برتنی چاہیے۔" مسز ورما کی بات کا اس کے ہسبینڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔
"تم لوگ باتیں کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"
"میں بناتا ہوں چائے۔ دِس اِز مائی جاب۔ تم بات چیت کرو۔" مسٹر ورما صوفے سے اُٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔
"دیکھا میرا ہسبینڈ کتنا اچھا آدمی ہے اور تم کتنے واہیات آدمی ہو۔"
"بالکل ٹھیک ہے مسز ورما۔ کیا میں آپ کا ہاتھ چھو کر دیکھ سکتا ہوں کہ اب وہ کتنا ٹھنڈا ہے۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر مسز ورما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔
"اب اتنا ٹھنڈا نہیں۔" وہ بولا۔
"اگر میرے ہسبنڈ نے دیکھ لیا تو یہیں سے کان پکڑ کر باہر نکال دے گا تمھیں۔"
"تو آپ کیا کریں گی؟"

"جو عورتیں ایسی حالت میں کرتی ہیں۔"

"کیا کرتی ہیں وہ؟"

"جب وہ کسی غیر مرد کے ساتھ کسی غلط سچویشن میں پکڑی جائیں، تو فوراً ہی اس مرد کے خلاف بیان دے کر اُسے پٹوا دیتی ہیں۔"

"آپ بھی ایسا ہی کریں گی؟"

"کب؟"

"جب مسٹر ورما آپ کو کسی غلط سچویشن میں ——؟"

"میرا ہسبنڈ بڑا بیلنسیڈ آدمی ہے۔"

"تو میں آپ کا ہاتھ ایک بار اور چوم لوں۔"

"نون سینس!"

اسی لمحہ مسٹر ورما چائے کی ٹرے لے کر ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ آدمی؟"

کہہ رہا تھا کہ مسٹر ورما بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"اور تم نے کیا کہا تھا، نون سینس؟"

"یس ڈارلنگ۔"

"تو تمھارا یہی خیال ہے؟"

"میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی۔ سیریس تھوڑی ہی تھی۔"

آنند بغیر ان دونوں کی گفتگو کی طرف دھیان دیتے پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے کی پیالیاں دونوں کو دیتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔ بالکونی میں "ویژن" کا بورڈ لگانے کا سلسلہ آخر اس طرح طے ہوا کہ اگر انکم ٹیکس والوں نے کوئی جھگڑا اٹھایا تو آنند فلیٹ کا کرایہ بڑھا دے گا اور فلیٹ اسے خالی نہیں کرنا پڑے گا۔

اس روز سرجو کے ساتھ بلجندر اور دلجیت بھی آئی تھیں۔

ٹری وینڈرم کی طویل ملاقاتوں کے بعد تینوں اکھٹی آنند کو ایک بار بھی نہیں ملی تھیں۔ سرجُو تو خیر "ویژن" کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہونے کے کارن ہر روز ہی آتی تھی، آنند کے گھر لیکن بلجندر اور دلجیت ایک ساتھ کبھی نہیں آئی تھیں۔ آنند کے گھر۔ یوں تو تین چار بار سترہ سیکٹر میں یا کسی پکچر ہاؤس کے باہر ان کی آنند سے ملاقات ہوجاتی رہی تھی لیکن وہ جو ٹری وینڈرم کی ملاقاتوں کا انداز تھا وہ چنڈی گڑھ میں رِی پیٹ نہ ہوسکا۔ کچھ تو آنند "ویژن" کے چکر میں ایک طرح سے بے ٹھکانہ ہو رہا تھا اور کچھ بلجندر اپنی شادی کے سلسلے میں مصروف تھی۔ دلجیت تو خیر اس کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن سرجُو "ویژن" کے معاملے میں بڑی سیریس تھی اور ڈیپارٹمنٹ سے آکر جو وقت اسے ملتا اسی میں لگا دیتی تھی۔ چھٹی کے تمام دن اب "ویژن" کی ہی نذر ہو رہے تھے۔ آنند کو کبھی کبھی لگتا کہ سرجُو نے اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ہی اُلجھا لیا تھا "ویژن" میں۔ اخبار تو اس کا تھا لیکن اسے ایس ٹیبلش کرنے کے لیے محنت سرجُو کر رہی تھی۔

اپنی شادی کا اِنوِی ٹیشن کارڈ دیتے ہوئے بلجندر نے کہا۔

"ری سیپشن میں ضرور آیئے آپ۔"

"تمہاری شادی ہے کب؟"

"اگلے سنڈے کو۔"

"یعنی ستائیس تاریخ کو؟"

"جی ہاں۔"

"ستائیس کو تو مجھے جانا ہے۔"

پوسٹ پون نہیں کر سکتے یہ وزِٹ؟"

"نہیں۔ ایک بہت ضروری میٹنگ ہے، بلجندر۔"

یہ سن کر بلجندر کا چہرہ اُتر گیا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ آنند ری سیپشن میں آنے سے انکار کر دے گا۔

"مجھے معلوم ہے جیسی میٹنگیں آپ کی ہوتی ہیں۔ وسکی پیو اور رعنا ن بھر کو گالیاں دو۔ اور ہوتا کیا ہے جرنلسٹوں کی میٹنگوں میں؟" سرجو بولی۔

"دہلی والی میٹنگ ایسی نہیں ہے۔"

"جیسی بھی ہے آپ دہلی نہیں جائیں گے۔"

"آئی۔ آلسوری کو پیسٹ۔" بلجندر نے نم آلود آنکھوں سے کہا۔

"اچھا بھئی ہم دہلی نہیں جائیں گے۔" آنند کی بات سن کر بلجندر کی آنسو بھری آنکھوں میں کچھ اس طرح کی چمک آ گئی، جیسے برسات کے فوراً بعد، ہلکی ہلکی سی پھوار میں، ایکدم دھوپ نکل آنے سے فضا رقص کرنے لگتی ہے۔

"آئی ایم گریٹ فل ٹو یو، آنند صاحب۔"

آنند نے انجانے ہی میں بلجندر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا اور پھر اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

"گاڈ بلیس یو، ڈیر۔"

بلجندر کے چہرے پر کھلی دھوپ کی چمک لہرا گئی۔

اگلے سنڈے کو آنند اور سرجو دونوں ہی بلجندر کی ری سیپشن میں گئے اور دونوں نے ایک مشترکہ گفٹ بھی بلجندر کو دیا۔ دُلھن کے لباس میں بلجندر بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔

"ری سیپشن سے لوٹتے ہوئے آنند نے سرجو سے پوچھا۔

"لڑکیاں بعد میں اتنی خوبصورت کیوں نہیں رہتیں، جتنی کہ وہ شادی کے دن ہوتی ہیں؟"

"آپ بتایئے "

"مجھے معلوم نہیں، تم بتاؤ۔"

"میں کون سی دُلھن بنی ہوں کبھی۔"

"لیکن بنو گی تو سہی ایک دن۔"

"ایک دن تو آپ بھی دولھا بنیں گے۔"

"نو چانس فار می۔"

"کیوں؟"

"آئی ڈانٹ وانٹ اِٹ۔ جو سٹیٹس عورتوں کا اس وقت ہمارے ملک میں ہے، میں اس کے خلاف ہوں۔ نوّے فی صد شادیاں لڑکیوں کی مرضی سے نہیں، ان کے ماں باپ کی مرضی سے ہوتی ہیں۔"

"تو اس میں کیا بُرائی ہے؟"

"اس میں بُرائی یہ ہے مس سرجو شرما، کہ جو لڑکی شادی کے دن اس طرح سجائی جاتی ہے۔ دُلھن کے روپ میں۔ وہی سال دو سال میں مٹّی کا تیل چھڑک کر جلادی جاتی ہے۔"

"یہ تو ہمارے سوشل سٹرکچر کا دوش ہے۔"

"مرد کیوں نہیں مرتا کبھی تیل چھڑک کر؟"

"اس لیے کہ وہ رسوئی گھر میں جاتا ہی نہیں، جہاں مٹّی کا تیل دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس کی تمام زندگی تو ڈرائینگ روم اور بیڈ روم میں گزرتی ہے۔" سرجو ہنسی۔

"اور اس لیے بھی کہ وہ زندگی بھر یہ نہیں جان پاتا کہ اس کے سارے گھر میں اور اس میں رہنے والے لوگوں کے ذہنوں میں، اتنی ہی گھٹن اور گرمی ہے جتنی کہ اس کے چھوٹے سے کچن میں، جہاں اس کی بیوی دن رات کام کرتی ہے۔"

"اور بچّے بھی پالتی ہے۔"

بچّے پالنے سے پہلے بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اسے۔" وہ ہنسا۔

"تو آپ کبھی شادی نہیں کریں گے؟" سرجو نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں فوراً ہی یہ جاننا چاہوں گا کہ صرف عورتیں ہی کیوں خودکشی کرتی ہیں۔ بہت گیانی بننے کی لالسا جگی رہے گی مجھ میں۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن میں خود اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر مر جاؤں گا۔"
"بڑی سینسیشنل نیوز ہوگی یہ تو۔" سرجو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تم "ویژن" میں ایک زبردست ایڈیٹوریل لکھنا مجھ پر۔"
"لیکن ـــ"
آنند نے اسے ٹوک دیا اور بولا۔
"لیکن جب تک یا تو "ویژن" بند ہو چکا ہوگا یا تمھاری شادی ہو چکی ہوگی اور تمھارا گھر والا نہیں چاہے گا کہ تم جرنلزم کا دھندا کرو۔"
"آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟"
"جب بھی کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے اور میرے نہ چاہنے کے باوجود جب بھی مجھے ریسیپشن میں جانا پڑتا ہے، تو میرے من میں رہ رہ کر ایک ہی سوال اُٹھتا ہے کہ یہ لڑکی اب اور کتنے دن زندہ رہے گی۔"
"یہی سوچ رہے تھے آپ بلجندر کی شادی میں بھی؟"
"ہاں۔ میں اس کی تقدیر پڑھ رہا تھا۔"
"کیا پڑھا آپ نے؟"
"پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔"
"کیوں؟"
"کہ تم ساتھ تھیں۔"
"میرے ساتھ ہونے سے کیا فرق پڑا تھا؟"
"تم دونوں کی تقدیریں آپس میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔"
"آخر کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟"
"یہ کہ تمھارے گھر والے، تمھارا اس طرح میرے ساتھ گھومنا پھرنا اور

دیر تک میرے فلیٹ میں رہنا، زیادہ دلوں تک برداشت نہیں کریں گے۔"

"پھر؟"

"یا تمہیں "ویژن" چھوڑنا پڑے گا، یا اپنے ماں باپ کو۔"

"میں "ویژن" نہیں چھوڑوں گی۔" سرجُو نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تو اپنے ماں باپ چھوڑنے پڑیں گے۔"

"ابھی تو اخبار کا پہلا ایشو بھی نہیں نکلا آنند صاحب۔ آپ ایسی غلط باتیں کیوں سوچنے لگے ہیں، ابھی سے۔"

"نہیں سوچنی چاہئیں ایسی باتیں۔ تمہارا خیال درست ہے۔ میرے ساتھ بس یہی جھگڑا رہتا ہے، مجھے وقت کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ بہت آگے نکل جانا چاہتا ہوں سمے سے اور اسی لیے پیچھے رہ جاتا ہوں دوڑ میں۔ آئی ایم سوری، سرجُو۔" اس نے سرجُو کے بازو پر بڑے پیار سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سرجُو کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد، جب وہ اپنے فلیٹ میں واپس آیا اور دروازہ کھولا تو اندر ایک تار پڑا تھا، جسے پوسٹ مین نے بند دروازے کے نیچے سے اندر سرکا دیا تھا۔

اس کے بڑی وینڈرم کے پریس رپورٹر دوست، میتھیو جارج کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ تار اس کی لڑکی مرسی کا تھا۔

آنند ایکدم سکتے میں آگیا!

"این ادر گڈ مین گان۔" وہ بڑبڑایا۔

اور پھر ایکدم پھپھک پڑا بے دردی سے!

اُسی لمحہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے دروازہ پھر بھی نہیں کھولا۔

اب کی دستک ذرا زور سے ہوئی۔ دروازہ پھر بھی بند رہا۔

اس کی لینڈ لیڈی مسز ورما آئی تھی۔

لیکن کوئی ریس پونس نہ پاکر، سیڑھیاں اتر گئی تھی !!

سات فروری کا دن بہت مہتوپورن رہا۔
"ویژن" کا پہلا ایشو ریلیز ہوا تھا اُس دن۔ ماؤنٹ ویو ہوٹل میں فنکشن تھا۔ چنڈی گڑھ کے سبھی زبانوں کے پریس رپورٹر، ٹربیون اور انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر، ہندی اور پنجابی ٹربیون کے ایڈیٹر، دونوں اخباروں کے فوٹوگرافروں کے علاوہ پنجاب سے شائع ہونے والے اخباروں کے ایڈیٹوریل سٹاف کے لوگوں اور ان کے فوٹوگرافروں کے ساتھ چنڈی گڑھ، پنجاب اور ہریانہ کے بہت سے افسر اور کچھ منسٹر بھی موجود تھے فنکشن میں۔ جالندھر سے ریڈیو اور دُور درشن کی ٹیمز بھی آئی تھیں فنکشن کی کوریج کے لیے۔ بہت بڑا ہنگامہ تھا۔ فوٹوگرافر کھٹاک کھٹاک کیے جا رہے تھے۔ کیمروں پر فلیش بلب جل اور بجھ رہے تھے۔ دُور درشن کا کیمرہ مین اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ تیز روشنی میں اپنا کیمرہ کئی اینگلز سے گھمائے جا رہا تھا۔

شام کے چار بجے فنکشن تھا۔ ختم ہوتے ہوتے سات بج گئے تھے۔ فنکشن میں شریک ہونے والے ہر شخص کے ہاتھ میں "ویژن" کا پہلا ایشو تھا جس میں راشٹرپتی سے لے کر، ہریانہ اور پنجاب کے چیف منسٹروں، چنڈی گڑھ کے چیف کمشنر کے علاوہ ملک بھر کے چوٹی کے جرنلسٹوں کے پیغام چھپے تھے۔ سبھی نے "ویژن" کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات بھیجیں تھیں۔ اخبار کے پہلے صفحے کے اُوپر والے حصے میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر سرجُو کا نام بھی چھپا تھا۔ سب سے زیادہ تصویریں بھی اسی کی اُتری تھیں۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں وہ بج بھی بہت رہی تھی۔

اس فنکشن میں سرجُو کا بھائی گورنجش بھی موجود تھا جس کے ساتھ یونی ورسٹی کے کچھ اسٹوڈینٹس بھی تھے۔ آنند نے گورنجش کو، اور اس کے دوستوں کو خاص طور سے

انوائیٹ کیا تھا۔ گوربخش چونکہ یونی ورسٹی سٹوڈینٹس یونین کا سکریٹری بھی تھا اس لیے اسے فنکشن میں انوائیٹ کرنا مناسب تھا۔ لیکن گوربخش بڑی مجبوری میں آیا تھا ورنہ وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ پچھلی شام ہی تو، سرجُو جب "ویژن" کے دفتر سے گھر لوٹی تھی گوربخش نے اُس سے کہا تھا۔

"تم آنند سے کہہ دینا میں اُس کے فنکشن میں نہیں آؤں گا۔"

"لیکن وہ صرف آنند کا فنکشن نہیں، میرا فنکشن بھی تو ہے۔"

"جانتا ہوں۔ آر۔ ایس۔ وی۔ پی میں تمھارا نام ہے۔"

"پھر تو تمھارا آنا اور بھی ضروری ہے۔"

"اسی لیے نہیں آؤں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟"

"مجھے یہ پسند نہیں کہ تم اس بدنام جرنلسٹ کے اخبار میں کام کرو۔"

"تمھیں کسی کے بارے میں اس طرح کے الفاظ کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"پہنچتا ہے۔ اسی لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ صرف میں ہی نہیں، ڈیڈی بھی یہی کہتے ہیں۔"

"مجھ سے تو کبھی نہیں کہا، انھوں نے کچھ۔"

"جن کی بیٹیاں خاندان کے بندھن توڑ دیں، انھیں ان کے ماں باپ اِگنور کر دیتے ہیں۔"

"اور جن کے بیٹے کسی بندھن کو نہ مانیں، ان کے پیرنٹس کیا کہتے ہیں انھیں۔"

وہ بچارے خاموش رہتے ہیں اور اپنی زبانیں خود ہی کاٹ دیتے ہیں۔"

"تمھاری وجہ سے میں بدنام ہو رہا ہوں یونی ورسٹی میں۔"

"پہلے تو بڑے نیک نام تھے تم۔ فنکشن میں نہیں آنا چاہتے تو مت آؤ۔ لیکن بات سوچ سمجھ کر کرو۔"

"تمھارا موپڈ ہر شام سہگل کے فلیٹ کے باہر کھڑا ہوتا ہے۔"

"اندر جگہ نہیں ہے، اس لیے باہر کھڑا کرتی ہوں موپڈ کو۔"

"میں جب کبھی اُدھر سے گزرتا ہوں تو میرے دل میں آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔"

"تو مت گزرا کرو اُدھر سے۔ تم کوئی اور راستہ بھی تو استعمال کر سکتے ہو۔ چنڈی گڑھ کی سڑکیں تو بہت کھلی ہیں۔"

"یُو سٹاپ گوانگ ٹو ہز فلیٹ۔" گوز بخش چیخا۔

"آئی کانٹ۔" سرجُو نے بھی تلخ لہجے میں جواب دیا۔

یہ کہہ کر سرجُو ڈرائینگ رُوم سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے لگا اس کے بھائی کے من میں حسد کی آگ جلنے لگی تھی۔ دُھواں دُور تک جا سکتا ہے، اسے محتاط رہنا چاہیے۔ پھر وہ دیر تک واش بیسن کے سامنے کھڑی اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ فروری کے شروع کے دنوں میں بھی سردی کا زور قائم تھا۔ اسے سردی تو لگتی رہی لیکن اس نے چہرے پر چھینٹے مارتے نہیں چھوڑے۔

رات کو ہوئی تلخ باتوں کے باوجود گوز بخش سات فروری کو ماؤنٹ ویو ہوٹل میں موجود تھا۔ اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ آنند کے فنکشن میں اتنے لوگ آئیں گے اور اس کی اتنی تعریف ہوگی اور اس کے فورٹ نائیٹلی کو اتنا اچھا ریسپونس ملے گا اور اس کی بہن کی شخصیت اتنی اہم ہو جائے گی۔ حسد کی جو آگ اس کے دل میں کئی دنوں سے دھیرے دھیرے سُلگ رہی تھی اب ایک الاؤ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ وہ جب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فنکشن کے بعد، ہوٹل سے باہر نکلا تو وہ رقابت کی آگ میں بُری طرح جل رہا تھا اور اُس کے ساتھی اُس آگ کو ہوا دے رہے تھے۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ جن جن سڑکوں سے گزرتا جا رہا تھا آگ کی لپٹیں وہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ گوز بخش کے ذہن کی فضا نے باہر کی فضا کو بھی خراب کر ڈالا تھا شاید۔ کوئی نو بجے کا وقت تھا۔

آنند کے فلیٹ میں پہلے صرف دو لوگ تھے۔
آنند اور سرجو۔

سرجو نے اپنے پروگرام کے مطابق میز پر کیک رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو بڑی موم بتیاں جلائی تھیں۔ کیک اس نے اور آنند دونوں نے مل کر کاٹا تھا۔ کیک کا ایک ٹکڑا اس نے آنند کے ہونٹوں سے تھوڑا سا کٹوا کر باقی کا حصہ اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ جلتی ہوئی موم بتیاں جلتی رہنے دی تھیں دونوں نے۔ آج دو برتھ ڈے تھے۔ ایک آنند کا دوسرا "ویٹرن" کا۔ اس لیے ایک بھی موم بتی نہیں بجھے گی۔ دونوں کم سے کم آدھی رات تک جلتی رہیں گی۔

پھر آنند نے اپنے لیے وسکی بنائی تھی۔ ایک لمبا سپ لے کر اس نے گلاس سرجو کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا جس نے صرف چھوا تھا وسکی کو اور صرف اس کا تلخ ذائقہ ہی چکھا تھا۔

"پیوں گی پھر کبھی، آج صرف ٹیسٹ دیکھا ہے شراب کا۔"

"جیسی تمھاری مرضی۔"

آنند نے گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی لمبے گھونٹ میں ختم کر ڈالا۔

اور پھر آنند کے فلیٹ میں ایک اور شخص کا اضافہ ہوگیا۔

مسز ورما آگئی تھی۔

"تمھارا فنکشن بہت کامیاب رہا، آنند۔"

"تھینک یو، مسز ورما۔"

آنند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چوم لیا۔

"آج آپ کا ہاتھ اتنا ٹھنڈا نہیں۔"

"تمھارے فنکشن سے واپس آنے کے بعد مسٹر ورما میرا ہاتھ سہلاتے رہے ہیں اور تمھاری تعریف کرتے رہے ہیں۔"

"چھڑی گھماتے ہوئے یا بغیر اس کے؟"

"چھڑی کے بغیر"

"مارولس!" آنند زور سے ہنسا اور مسز ورما کے لیے ڈرنک بنانے لگا۔

"ایک پیس کیک کا لیجیے مسز ورما" سرجُو نے کیک کے دو پیس پلیٹ میں رکھ کر مسز ورما کو پیش کیے۔

"بس ذرا سا ہی لوں گی۔ ورنہ وسکی کا مزا نہیں آئے گا۔"

پھر مسز ورما نے اپنا گلاس آنند کے گلاس سے دھیرے سے ٹکرایا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو محبّت سے دیکھتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگا لیے۔

اور پھر مسز ورما نے آنند کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرجو کو مخاطب کیا۔

"گڈ لک ٹو یُو ینگ لیڈی۔"

"تھینک یُو میڈم۔"

"تم ہیں دیرٹن بھی ہے۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"جی، سرجُو۔"

"اچھّا نام ہے۔ مجھے اچھے نام بہت پسند ہیں۔ ورما صاحب کا نام بڑا واہیات ہے۔"

"آپ کے ہسبینڈ کا؟" سرجُو نے پوچھا۔

"کیوں ہسبینڈز کے نام واہیات نہیں ہوتے؟"

"اکثر ہوتے ہیں مسز ورما" آنند بولا۔

"تم فضول بہت آدمی ہو۔"

"ہسبینڈز فضول آدمی بھی ہوتے ہیں، مسز ورما۔"

"تم دلگر بھی ہو۔"

"یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں۔"

"وہ کسی دوسرے کانٹیکسٹ میں تھی۔"

"لیکن سچائی تو چاہے کسی بھی کانٹیکسٹ میں ہو، سچائی ہی رہتی ہے۔"

"تم انٹیلی جینٹ بھی ہو۔"

"جو اکثر ہسبینڈ نہیں ہوتے۔"

آنند کی اس بات پر سرجو بہت زور سے ہنسی۔

پل بھر کے بعد، وسکی کا تقریباً آدھا گلاس ختم کر دینے کے بعد مسز ورما نے پوچھا۔

"تم دونوں میں سے ہوسٹ کون ہے؟"

"سرجو ہے، مسز ورما۔"

"تو تم نیچے جاکر، ورما صاحب کو بھی بلا لاؤ۔ آنند کے کہنے سے وہ نہیں آئیں گے۔"

"میں جاتی ہوں انھیں بلانے۔"

سرجو نے اپنی چائے کی پیالی میز پر رکھی اور سیڑھیاں اتر کر مسٹر ورما کو بلانے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مسز ورما نے آنند سے کہا۔

"ماؤنٹ ویو میں تم اتنی کیوٹ عورتیں کہاں سے اکٹھی کر لائے تھے۔"

"ویژن مسز ورما۔ لیکن آپ سے زیادہ کیوٹ کون عورت تھی وہاں؟"

"یو آر ریئلی ولگر۔"

یہ سن کر آنند نے مسز ورما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک بار پھر چوم لیا اور مسز ورما نے گلاس میں بچی ساری شراب ایک ہی گھونٹ میں ختم کر ڈالی۔

جب سرجو مسٹر ورما کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو آنند اور مسز ورما آنند کے ایک جوک پر مل کر قہقہے لگا رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مسٹر ورما نے کہا۔

"آپ کے استقبال کے لیے پھلجڑیاں ہیں۔" آنند نے جواب دیا۔

"اے سمارٹ فیلو" مسٹر ورما ہنسے۔
سرجو نے کیک کے پیس مسٹر ورما کو پیش کیے تو وہ بولے۔
"اگر میں نے شراب کو ہاتھ لگانے کی قسم نہ کھائی ہوتی تو آج ضرور وسکی پیتا۔"
"آپ ہاتھ مت لگایئے گلاس کو، میں خود ہی اسے آپ کے ہونٹوں تک لے جاؤں گا۔"

"اب بہت دُور نکل آیا ہوں آنند"
"تھوڑا پیچھے پلٹ چلیے"
"اِٹ اِز ٹو لیٹ ناؤ"
"آپ ہی کہیے مسز ورما"
"مجھ سے کہنے کی بجائے یہ اپنے آپ سے کہیں گی"
"ورما، وٹ اِز دِس؟" مسز ورما نے اپنے خاوند کو گھورتے ہوئے کہا۔
"سوری میڈم۔ یہ ینگ لوگ ہمیشہ بڑوں میں جھگڑا کرواتے ہیں"
"جانتے ہو کیوں ڈارلنگ؟"
"اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے" مسٹر ورما نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی پیالی میں چائے کا پانی ڈالنے لگے۔
"میرے لیے چائے بناتے بناتے اب مسٹر ورما کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ کسی کی بنائی ہوئی چائے انھیں پسند نہیں"
"ہیبٹ فارمیشن"
"آئی انڈرسٹینڈ ورما صاحب" آنند بولا۔
"تم خاک انڈرسٹینڈ کرو گے، اے سٹوپڈ فیلو"
"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" سرجو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نام کٹوا دوں گا اسسٹنٹ ایڈیٹری سے۔ یہ بات بھی یاد رکھنا ۔۔۔"
آنند ابھی اپنی بات مکمل نہیں کرنے پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ مسز ورما نے کھولا۔
"فرمایئے۔"
"مسٹر آنند سہگل ہیں؟"
"جی۔ ان کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آپ اندر آجایئے۔"
"نہیں۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ سرجُو شرما ہو گی اندر؟"
"وہ ہے۔"
"میں اُس کا بھائی ہوں۔"
"تو اندر آجاؤ، ینگ مین۔"
"آپ اُسی کو باہر بھیج دیں۔"
مسز ورما نے اندر جا کر سرجُو کو باہر بھیج دیا۔
"اندر آجاؤ گوز بخش، باہر کیوں کھڑے ہو، اجنبیوں کی طرح۔"
"ڈیڈی نے تمھیں فوراً بلایا ہے۔"
"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"
"کچھ گیسٹ آئے ہوئے ہیں گھر میں۔"
"میرے بھی گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔
"تو تم نہیں چلو گی میرے ساتھ؟"
"سوری، گوز بخش۔ میں ذرا دیر سے آؤں گی۔"
"ٹو ہیل وِدھ یُو۔" وہ چیخا اور دروازہ زور سے بند کر کے سیڑھیاں اُتر گیا۔
سرجُو نے کھڑکی سے دیکھا گوز بخش اپنا موٹر سائیکل سٹارٹ کر رہا تھا۔
"کون تھا؟" آنند نے پوچھا۔
"گوز بخش!"
"اندر کیوں نہیں لے آئیں اُسے؟"
"وہ جلدی میں تھا۔"

"تو مجھ سے کہا ہوتا۔"

"وہ مجھے لینے آیا تھا، گھر میں کچھ گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔"

"تو تم گئیں کیوں نہیں؟"

"ہر بات کا ایکسپلینیشن نہ مانگیے آنند صاحب۔"

"یہ مرد تو ایکسپلینیشن مانگنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ ڈاونٹ گو ایکسپلینیشن۔"

"یس مسز ورما۔"

بات آگے نہیں بڑھی۔

جب مسٹر اور مسز ورما نیچے چلے گئے، تو آنند نے سرجُو سے کہا۔

"تمھیں گھر تک چھوڑ آؤں؟"

"کب تک چھوڑتے رہیں گے؟"

"جب تک تم کہو گی۔"

"میں ذمہ دار لڑکی ہوں۔ آئی کین لُک آفٹر مائی سیلف۔"

"آل رائٹ۔"

"اب اور مت پینا۔ کھانا کھا کر سو جائیے گا۔"

"اچھا نیچے تک تو چھوڑ آؤں؟"

"آپ مجھے کہیں تک بھی چھوڑنے نہیں جائیں گے۔"

"اچھا بابا۔ اچھا۔"

سرجُو تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

آنند نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ سرجُو موپڈ سٹارٹ کر کے مین روڈ کی طرف نکل گئی تھی۔

سرجُو کو لگا گوربخش کے ذہن میں جلتے ہوئے الاؤ کے شعلے سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔

گھر کے گیٹ پر پہنچی جب سرجُو، تو اُسے لگا لوہے کا گیٹ بھی الاؤ کے شعلوں

سے تپ رہا تھا۔

جب اس نے کال بیل پر انگلی رکھی تو اسے محسوس ہوا جیسے بجلی کا کرنٹ اس کے بدن میں پھیل گیا تھا، کھشن بھر میں!

اوپر سے جھانکا تھا سرجو کے ڈیڈی نے۔

"آرہا ہوں"

سرجو کے ڈیڈی نیچے آئے تھے۔ دروازہ کھولا تھا اور پھر بِنا کچھ کہے خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گئے تھے۔

سرجو جب گیلری میں موپڈ کھڑا کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اسے محسوس ہوا جیسے ہر زینے میں بجلی کا کرنٹ پھیل رہا تھا۔ اس کے پاؤں گویا لڑکھڑا رہے تھے۔ ابھی گری کہ ابھی گری۔

سات فروری کا جنتو پورن دن شاید اپنی اہمیت ایکدم کھو چکا تھا اب تک!

لیکن کچھ دیر پہلے دُور درشن سے جو خبریں آئی تھیں ان میں "ویژن" کے پہلے البیشو کا ذکر تھا۔ اور جو تصویریں دکھائی گئی تھیں اس خبر کے ساتھ، اُن میں سرجو شرما کی بہت ہی خوبصورت تصویر تھی۔

لیکن یہ تو کچھ دیر پہلے کی بات تھی جب گوربخش، آنند کے فلیٹ پر گیا تھا سرجو کو ساتھ لانے کے لیے۔ اب تو گھر کا ماحول بدل چکا تھا اور گھر کے لوگوں نے اپنے ذہنوں سے سرجو شرما کی وہ خوبصورت تصویر اُتار دی تھی، جسے دُور درشن نے سکرین پر بڑی نفاست سے اُبھارا تھا، خبریں ٹیلی کاسٹ کرتے ہوئے۔

"ویژن" خاصا مقبول ہو گیا تھا۔

آنند نے اب "ویژن" کا دفتر اپنے فلیٹ سے منتقل کر لیا تھا۔ یوں تو اس کا نام ایکریڈٹڈ کاریسپانڈینٹس کی فہرست میں شامل تھا اور اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی ایلاٹ ہو سکتا تھا، لیکن اُس نے کوشش ہی نہیں کی تھی اور موجودہ سسٹم میں جائز کام بھی بِنا کوشش کے نہیں ہوتے۔ چنانچہ اُس نے دفتر کے لیے الگ جگہ کرائے

پر لے لی تھی اور اپنے فلیٹ کے باہر لگے " ویژن " کے بورڈ کو ہٹا دیا تھا۔
مسٹر ورما اس کا لینڈ لارڈ اس بات پر بہت خوش تھا۔
بہت سے اور لوگ بھی خوش تھے، جو اس کے ویل وشرز تھے۔ ان میں پریس کے لوگ تھے، پی جی آئی کے ڈاکٹر تھے، ہریانہ، پنجاب اور یونین ٹیریٹری چنڈی گڑھ کے افسر تھے۔ یونی ورسٹی کے پروفیسر تھے۔
لیکن کچھ لوگ آنند سے ناخوش تھے۔ جو اُسے وہیں دیکھنا چاہتے تھے عمر بھر، جہاں وہ کچھ عرصہ پہلے کھڑا تھا۔ آگے بڑھنے کے عمل میں، رکاوٹیں پیدا کرنے والے ایلی مینٹس بھی تو موجود رہتے ہیں ہر جگہ۔ یہی ہوتا آیا ہے ہمیشہ۔ ارتقا کا یہ عمل چاہے انفرادی ہو چاہے مجموعی۔ چاہے وہ ایک ملک یا قوم کا ہو چاہے کچھ ملکوں اور کچھ قوموں کے گروپ کا۔ شاید اسی لیے تیسری دنیا کے ملکوں اور قوموں سے کچھ ملک اور قومیں ناخوش ہیں۔
کوئی آگے کیوں بڑھے ؟
وہ کیوں نہ ایک ہی جگہ پر پڑا سڑتا اور گلتا رہے ؟
" کیا حق ہے کسی کو ترقی کرنے کا ؟ "
کسی کی ترقی اور کامیابی ہی اس کی مخالفت کی ضامن ہے۔ جبھی تو غالب نے کہا تھا۔

ہیولا برقِ خرمن کا ہے   خونِ گرم دہقاں کا

پنجاب یونی ورسٹی کی سٹوڈینٹس یونین کے الیکشنز ہونے والے تھے۔ سرجو کا بھائی گور بخش الیکشن لڑ رہا تھا
گور بخش پچھلے سات برسوں سے یونی ورسٹی میں تھا اور نیتا گیری کر رہا تھا۔ وہ ایم اے کے ایک سبجیکٹ میں فیل ہوتا تو اگلی بار دوسرے سبجیکٹ میں داخلہ لے لیتا۔ ہاسٹل میں اس نے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ گھر میں تو صرف نام مانتر ہی آتا تھا۔ رہتا بھی ہاسٹل میں ہی تھا۔ رات کا کھانا تو اکثر ہاسٹل میں ہی کھاتا تھا۔

البتہ دن کا کھانا کبھی گھر میں کھا لیتا تھا۔ تمام دن موٹر سائیکل پر کسی نہ کسی کو پیچھے بٹھائے، فل سپیڈ پر یونی ورسٹی کی سڑکوں پر اُڑتا رہتا تھا۔ رات دن اس کے جھگڑے ہوتے تھے۔ چار چھے مہینوں میں ایک بار وہ ہاتھ پاؤں تڑوا کر پی جی آئی میں ایڈمٹ رہتا تھا۔ سرجو سے بھی اس کی کم ہی بنتی تھی۔ اور گورنجش کی وجہ سے سرجو کو بھی یونی ورسٹی میں بہت سے سٹوڈینٹس اور ٹیچرز جانتے تھے اور کبھی کبھی دونوں کا مقابلہ کرتے تو ووٹ گورنجش کے پکھش میں کم اور سرجو کے پکھش میں زیادہ پڑتے تھے۔ بہن بھائی کے نظریاتی اختلافات اتنے زیادہ تھے کہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت ہی کم بات چیت کرتے تھے۔

سرجو کے ماں باپ کو اس بات کا بہت رنج تھا۔ ان کے دو ہی بچے تھے اور ان کی آپس میں بالکل بھی دوستی نہ تھی۔ سرجو کی ماں تو رامائن اور گیتا کے پاٹھ ہی میں زیادہ سمے گزارتی تھی اور اس طرح اس نے فرار کا ایک راستہ تلاش کر لیا تھا۔ لیکن سرجو کے فادر ماسٹر جگدیش رائے تو ایک سکالر قسم کے آدمی تھے اور بہت حساس تھے اس لیے انھیں یہ محسوس کر کے بہت تکلیف ہوتی تھی کہ ان کا بیٹا ایکدم مخالف سمت کی طرف بڑھے جا رہا تھا اور دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو برداشت نہ کرتے تھے۔

ماسٹر جگدیش رائے بڑے غریب گھر سے تھے اور تقسیم سے پہلے جڑانوالہ کے سکول میں وہ ماسٹر لگے تھے۔ انھوں نے شادی بھی ایسی لڑکی سے کی تھی جو بڑی سادہ طبیعت کی تھی۔ کھدر پہنتی تھی اور لڑکیوں کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ تقسیم کے بعد جب وہ ہندستان آئے تو ماسٹر جگدیش رائے جگراؤں کے سکول میں ماسٹر لگ گئے اور ان کی بیوی بھی وہیں کے گرلز سکول میں استانی لگ گئی۔ ماسٹر جگدیش رائے تو ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئے لیکن ان کی بیوی، چونکہ صرف میٹرک تھی اور اس نے واجبی سی ٹریننگ لے رکھی تھی، اس لیے وہ ٹیچر کے طور پر ہی ریٹائر ہوئی تھی۔

ماسٹر جگدیش رائے نے بڑی سمجھداری سے زندگی گزاری تھی اس لیے انھوں نے چار پیسے بھی بچائے تھے، بڑھاپے کے لیے۔ انھوں نے ایک بہت اچھا کام یہ کیا کہ گورنمنٹ سے قرضہ لے کر اپنا ایک چھوٹا سا اڑھائی منزلہ مکان بھی بنوالیا تھا چنڈی گڑھ میں۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ چنڈی گڑھ ہی میں آگئے۔ گراؤنڈ فلور میں خود رہنے لگے اور اوپر کی ڈیڑھ منزل انھوں نے کرایے پر چڑھا دی۔ دونوں میاں بیوی کی پینشن اور مکان کے کرایے سے ان کا بہت اچھا گزارہ ہونے لگا۔ ماسٹر جگدیش رائے کی ایک تمنا یہ تھی کہ ان کے دونوں بچے اچھے پڑھ لکھ جائیں اور اچھی جگہوں پر سیٹل ہو جائیں۔

لیکن گورنخش نے انھیں مایوس کر دیا تھا۔

اور رفتہ رفتہ ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ اب ماسٹر جگدیش رائے اپنی بیٹی سرجُو سے بھی ناخوش رہنے لگے تھے۔ وہ تو ویسے ہی اس بات کے خلاف تھے کہ سرجُو ماس کمیونیکیشن میں داخلہ لے اور اس کے بعد جرنلزم میں جائے۔ وہ تو چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے سبجیکٹ میں ایم کرے اور سول سروسز کے کامپیٹیشن میں بیٹھے۔ لیکن ماس کمیونیکیشن کرنے کے بعد جب سے سرجُو نے پوری طرح "ویژن" جوائن کر لیا تھا، وہ اس سے ناراض تھے۔ گورنخش نے ان کے مسلسل کان بھرتے رہنے کے بعد اپنے پیرینٹس کو سرجُو سے اور بھی زیادہ ناراض کر دیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ آنند کے خلاف بولتا رہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو سرجُو سے اس کا رشتہ بالکل ہی ٹوٹ سا گیا اور دوسرا یہ کہ ماسٹر جگدیش رائے آنند کے پوری طرح خلاف ہو گئے۔

اس پس منظر کے ساتھ جب ایک دن گورنخش نے سرجُو سے کہا کہ وہ "ویژن" کی وساطت سے یونی ورسٹی کی الیکشنز میں اس کی مدد کرے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"ہم یونی ورسٹی کی پالیٹکس سے اپنے آپ کو جوڑنا نہیں چاہتے۔"

"کیوں؟"

"یہ بات "ویژن" کی پالیسی کے خلاف ہے۔"

"آنند سے بات کر لوں۔"

"ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"سوچ لو۔"

"کیا سوچ لوں؟"

"پٹوا دوں گا سالے کو۔"

"اوقات تو تمھاری یہی ہے۔ لیڈری کرتے ہو سٹوڈینٹس کی، ایکسپلائٹ کرتے ہو انھیں۔" سرجُو نے تیکھے انداز سے جواب دیا۔

"وہ سالا تمھیں ایکسپلائٹ نہیں کر رہا؟" گورنخش غصّے سے بولا۔

"شٹ اپ یو مین فیلو۔"

"آئی شیل سی ٹو اِٹ۔"

یہ کہتے ہوئے گورنخش ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

آج وہ خاص طور سے گھر آیا تھا، اتوار کے دن کہ سرجُو سے بات کرے گا اور اگر الیکشنز میں اس نے "ویژن" کی مدد کا یقین دلایا تو وہ سرجُو سے عارضی طور پر سمجھوتہ کرے گا۔ مستقل طور سے تو سرجُو سے اس کا سمجھوتہ کبھی نہیں ہو سکے گا شاید۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا اور ان کی ساری جائیداد اور بینک میں جمع روپیا اسی کو ملنا چاہیے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرجُو کا جلدی سے بیاہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ وصیت میں سب کچھ اپنے نام کروالے۔ ماسٹر جگدیش رائے اب بزرگ ہو گئے تھے اور بیمار بھی رہتے تھے۔ گورنخش کی مخالفت ان سے نہ ہو سکے گی بہت دیر تک۔ بس یہی ایک خواب تھا جسے وہ بہت دنوں سے پالے جا رہا تھا۔ اور وہ اس خواب کو کسی بھی قیمت پر پورا کرنا چاہتا تھا۔

عام طور سے آنند اور سرجُو جب بھی کسی پریس کانفرنس میں جاتے تو الگ

الگ جاتے۔ آنند اپنے سکوٹر پر جاتا اور سرجو اپنے موپڈ پر۔ کیمرہ بھی سرجُو کے پاس ہی ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ آنند نہ پہنچ سکتا لیکن سرجُو پریس کانفرنس کبھی مس نہیں کرتی تھی۔ کانفرنسوں کی رپورٹنگ بھی وہی کرتی تھی۔ آنند تو اسی کوشش میں رہتا تھا کہ سرجُو اِنڈی پینڈینٹ طور پر کام کر سکے۔ ہاں ایڈیٹوریل وہ خود ہی لکھتا تھا اور اس پر وہ محنت بھی بہت کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹوریلز کی لوگ تعریف کرتے تھے اور بہت دنوں تک ان کا چرچہ رہتا تھا۔

اُس دن ایک سینٹرل منسٹر کی بہت ہی اہم پریس کانفرنس تھی۔ آنند کی اس میں شرکت بہت ضروری تھی۔ سرجُو کا موپڈ اچانک خراب ہو گیا تھا اور سٹارٹ ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا موپڈ آنند کے فلیٹ کے باہر ہی کھڑا کر دیا اور اس کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر اپنے کندھے سے کیمرہ لٹکائے کانفرنس میں گئی۔ کانفرنس کافی دلچسپ رہی۔ کسی قسم کا تناؤ پیدا نہ ہوا۔ سینٹرل منسٹر خاصا سمجھدار اور حاضر جواب شخص تھا۔ وہ پریس رپورٹرز کے سوالوں کا جواب بھی دیتا رہا اور بیچ بیچ میں کوئی ایسا کومینٹ بھی کر دیتا جس سے ماحول بڑا لائٹ ہو جاتا۔ کانفرنس دیر تک چلی۔ چائے کے دوران سرجُو بھی منسٹر سے باتیں کرتی رہی اور اس کی تصویریں بھی لیتی رہی۔ پریس کانفرنس ایک اچھا خاصا فارمل فنکشن بن گیا، جو دیر میں ختم ہوا۔

واپسی پر جب سرجُو آنند کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھی روز گارڈن کے قریب پہنچی تو چار نوجوان سڑک پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے سکوٹر کو روک لیا۔

"کیا بات ہے بھائی؟" آنند نے سکوٹر کو روکتے ہوئے پوچھا۔

"تمھارا نام آنند سہگل ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا

"جی ہاں۔"

"تم اس لڑکی کو کہاں لیے جا رہے ہو؟" ایک لڑکے نے سکوٹر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سرجُو سیٹ سے اُتر کر سڑک پر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مجھے پہچانتے ہو تم لوگ؟" جب کسی نے جواب نہ دیا تو وہ بولی۔
"میں سرجو ہوں۔ گورنخش کی بہن، جس نے تمہیں بھیجا ہے۔ کیا چاہیے تمہیں؟"
جواب کسی نے نہیں دیا۔
"سکوٹر کے ہینڈل سے ہاتھ اٹھا لو" اس نے آگے بڑھ کر بلند آواز سے کہا۔
لڑکے نے ہینڈل سے ہاتھ اُٹھا لیا۔
"غنڈہ گردی کر کے الیکشنز جیتنا چاہتے ہو۔ ہار جائے گا تمہارا لیڈر، کہہ دینا اس سے۔"
"آپ سکوٹر سٹارٹ کیجیے" اس نے آنند سے کہا اور خود پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
سڑک پر کھڑے لڑکے ایک طرف ہٹ گئے۔ سکوٹر آگے بڑھ گیا۔
جب آنند اپنے فلیٹ پر پہنچا تو بہت پریشان تھا۔
"آئی ایم سوری آنند صاحب۔"
"تمہیں معلوم تھا کہ اس قسم کا واقعہ ہونے والا ہے؟"
"ہاں۔"
"مجھے کیوں نہیں بتایا؟"
"مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ گورنخش اتنی کمینی حرکت کرے گا۔"
"تمہاری کوئی بات ہوئی تھی اس سے؟"
"ہوئی تھی، پچھلے اتوار کو۔ کہہ رہا تھا کہ "ویژن" یونیورسٹی الیکشنز میں اس کی مدد کرے۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔"
"ٹھیک کیا تھا تم نے۔"
"اس نے دھمکی دی تھی جبھی، آپ کو بتلانے کی۔"
"میرے نوٹس میں لا دینی چاہیے تھی یہ بات، تمہیں۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اس واقعے کا ذکر ڈیڈی سے کر دوں گی۔

کر دوں نا؟"

"کر دو، کوئی حرج نہیں۔"

"میرے کارن آپ کی انسلٹ ہوئی۔"

"اخبار والوں کا پروفیشن بہت رِسکی ہے سرجو۔ شیشے کے نکیلے ٹکڑوں پر چلتے ہیں ہم لوگ۔ وہ اخبار والا ہی کیا جس کے پاؤں میں تیز تیز کرچیاں نہ چبھیں۔ یو ڈاونٹ بادر۔"

سرجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ آنند کے کندھے پر ٹکا دیا اور سسکنے لگی۔

"میں ہی ذمہ دار ہوں اس کی۔ مجھے معاف کر دیجیے آنند صاحب۔"

"ڈاونٹ بی سلی۔" آنند نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

جانے سے پہلے سرجو نے کہا۔

"کانفرنس کی رپورٹ آپ ہی تیار کر لیجیے۔ میں نہیں کر پاؤں گی اس حالت میں۔"

"میں کر لوں گا۔ ڈاونٹ وری۔"

جب سرجو سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو آنند نے کہا۔

"چلو میں چھوڑ آتا ہوں تمھیں۔ واپس آ کر تمھارا موپڈ اندر رکھ دوں گا۔ چابی دے دو۔"

سرجو نے پرس میں سے موپڈ کی چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"میں خود ہی جاؤں گی آج، ایک دم اکیلی۔ کوئی نہیں جائے گا میرے ساتھ۔"

"رکشا والا بھی نہیں؟" آنند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ جائے گا۔" سرجو بھی مسکرا دی۔ "بائی بائی۔" اس نے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

آنند کچھ لمحے گیٹ پر کھڑا سرجو کو مین روڈ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا اور

گھر پہنچ کر پہلی بات جو سرجُو نے اپنے ڈیڈی سے کی وہ بہت پریشان کُن تھی۔
"میں کل صبح گوزبخش کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا رہی ہوں۔"
"کیوں، ایسی کیا بات ہوگئی؟"
"اُس نے آنند صاحب کو اور مجھے غنڈوں سے پٹوانے کی کوشش کی ہے۔"
"وہ کیوں ایسا کرے گا؟"
"کرے گا نہیں ڈیڈی، کیا ہے اس نے۔ آج ہی کوئی گھنٹہ بھر پہلے۔"
"دِس اِز ویری سیڈ۔"
سرجُو خاموش رہی۔
"مجھے معلوم نہیں تھا وہ اتنی کمینی حرکتوں پر اُتر آئے گا۔ لیکن پولس میں رپورٹ مت درج کرانا۔ بہت بدنامی ہوگی۔" اس کے ڈیڈی نے کہا۔
"آپ کی تو بدنامی نہیں ہوگی۔ جس کی ہوگی اُس کی نیک نامیاں پہلے ہی بہت ہیں۔"
ماسٹر جگدیش رائے نے اپنی بیٹی سے بحث نہیں کی۔ بحث کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔
لیکن اس کی ماں نے رات کو سرجُو سے بات کی اور اسے سمجھایا۔ بات آخر ٹل گئی۔ گوزبخش سارا ہفتہ گھر سے غائب رہا۔
جس روز سٹوڈینٹس یونین کے الیکشن ہونے تھے، اسی صبح کو سٹوڈینٹس کے دو گروپوں میں جم کر جھگڑا ہوا۔ الیکشن ملتوی ہوگئے اور یونی ورسٹی کیمپس میں پولس تعینات کر دی گئی۔
گوزبخش نے کسی بھی سبجیکٹ میں ایم اے کیے بغیر ہی یونی ورسٹی چھوڑ دی۔
اب یونی ورسٹی میں اس کی لیڈری بھی ختم ہوگئی تھی۔
مخالف دھڑے کے سٹوڈینٹس پاور میں آگئے تھے۔ اس لیے اسے یونی ورسٹی

میں اب کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ویسے وہ کیمپس میں کبھی کبھی چلا جاتا تھا اور یونی ورسٹی کی پالٹیکس کے بارے میں اس کی واقفیت رہتی تھی۔ ڈرگس کا استعمال تو اس نے کئی برس پہلے شروع کر دیا تھا۔ اس لئے اسے وہ ٹھکانے بھی معلوم تھے جہاں سے ڈرگس ملتی تھیں۔ لیکن یونی ورسٹی چھوڑنے کے بعد اب اُسے ایسی چیزیں حاصل کرنے میں دِقّت پیش آتی رہتی تھی۔ ویسے اس کے روزمرہ کے معمول میں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ گھر سے ناشتہ لے کر نکل جاتا اور پھر شام کو بھی دیر سے ہی لوٹتا۔ اب اُسے ماں باپ سے اپنے خرچ کے لیے پیسے مانگنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن کچھ نہ کچھ رقم تو اسے چاہیے ہی تھی، اس لیے اس نے ایک ٹریول ایجنسی میں کمیشن پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پنجاب کے دیہات سے کم پڑھے لکھے بے کار نوجوان گلف کنٹریز میں جانے کے لیے بڑے بیتاب تھے۔ گورنخش نے ایسے لوگوں سے اپنا رابطہ قائم کر لیا تھا۔ کچھ رقم وہ ان لوگوں سے لے لیتا اور کچھ کمیشن اسے ٹریول ایجنسی سے مل جاتی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ انڈر ورلڈ لائف کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کرنے لگا۔ اور اس طرح دھیرے دھیرے گورنخش کی زندگی کا سارا پیٹرن ہی بدلنے لگا۔

ماسٹر جگدیش رائے کی صحت اب بگڑتی جا رہی تھی اور اب انھوں نے گھر سے باہر نکلنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ گورنخش کہیں سیٹل ہو جائے تو وہ اس کی شادی کر دیں اور پھر سرجو کی شادی کے بارے میں سوچیں لیکن گورنخش اس طرف دھیان ہی نہ دیتا تھا۔

ایک دن جب اس سلسلے میں تفصیل سے بات ہوئی تو گورنخش نے کہا۔

"میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟"

"پہلے میں کہیں ٹھیک طرح سے سیٹل ہو جاؤں۔"

"کب سیٹل ہو گے؟" ماسٹر جگدیش رائے نے پوچھا۔

"میں جیوتشی نہیں ہوں۔"

اس جواب پر اس کی ماں کو غصہ آگیا اور وہ بولی ۔

"کم سے کم بات کرنے کا ڈھنگ تو سیکھو، گورنجش۔"

"مجھے تو یہی ڈھنگ آتا ہے ۔"

"شرم آنی چاہیئے تمھیں۔ اس طرح بات کرتے ہیں اپنے فادر سے ؟" ماں نے ڈانٹا۔

"فادر کون سا ڈپٹی کمشنر ہے ۔ سکول ماسٹر ہی تو ہے وہ بھی ریٹائرڈ!" وہ ہنسا

"اور زور سے ہنسو، میرے بیٹے، اپنے بوڑھے باپ پر، جس نے تمھیں اس پر ہنس سکنے کے قابل بنایا ہے ۔" یہ کہ کر ماسٹر جگدیش رائے اُٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گورنجش بھی اُٹھ کر چلا گیا۔

جب سرجُو گیلری میں اپنا موپڈ کھڑا کرکے اوپر آئی تو اس کی ماں بُری طرح رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ماں ؟" اس نے ماں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہی جو روز ہوتا ہے ۔"

"گورنجش سے پھر جھگڑا ہوا کیا ؟"

"آج اس نے تمھارے ڈیڈی کی بے عزتی کر دی ۔"

"اور کر بھی کیا سکتا ہے وہ ؟ اور اسے آتا بھی کیا ہے ؟" سرجُو نے اپنے دوپٹے سے ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اسے کہیں ڈھنگ سے سیٹل ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔ وہ تو سمجھتا ہے کہ باپ کی ساری جائیداد اور بینک میں جمع سارا روپیا اسی کا ہے ۔ وہ تو کوئی چھین نہیں سکتا ۔"

"کیوں نہیں چھین سکتا ؟"

"اس لیے کہ ہمارے ہاں یہی پرتھا ہے ۔ خاندان تو بیٹے سے آگے بڑھتا

ہے، بیٹی سے تو نہیں۔ بیٹی تو ابھیشاپ ہے بھگوان کا۔"
"گوز بخش جیسے بیٹے سے بڑا ابھیشاپ کوئی نہیں۔" ماں نے جواب دیا۔
سرجو نے ماں کی بات پر کوئی کومینٹ نہیں کیا۔
وہ اٹھ کر اپنے ڈیڈی کے کمرے میں گئی۔ ماسٹر جگدیش رائے دیوار کی طرف منہ کیے خاموش لیٹے تھے۔ سرجو نے انھیں ڈسٹرب نہیں کیا۔
ایک بار پھر ویسی ہی سچوایشن ری پیٹ ہوئی۔
سرجو کی ماں نے گوز بخش کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ وہ لوگ گوجرانوالہ کے تھے۔ اور ان کی چنڈی گڑھ کے انڈسٹریل ایریا میں ایک فیکٹری تھی۔ وہ لوگ شام کو لڑکا دیکھنے کے لیے آنے والے تھے۔ سرجو بھی "ویژن" کے دفتر سے جلدی واپس آگئی تھی۔ ماں نے اس سے کہہ دیا تھا۔ حالانکہ اس روز اخبار پریس میں جانا تھا۔ آنند نے اسے خود ہی کہا تھا کہ وہ گھر چلی جائے کیونکہ اس کا گھر میں ہونا ضروری تھا۔
ماسٹر جگدیش رائے نے تو گوز بخش سے کچھ نہیں کہا لیکن ماں نے اس سے بات کی تھی "شام کو گھر ہی میں رہنا۔"
"کیوں؟"
"کچھ لوگ آرہے ہیں، تمھیں دیکھنے۔"
"میری تصویر دکھا دینا انھیں۔"
سرجو دخل تو نہیں دینا چاہتی تھی ماں بیٹے کی بات چیت میں لیکن گوز بخش کا یہ جواب اسے اچھا نہیں لگا۔
"وہ تمھیں دیکھنا چاہیں گے تمھاری تصویر کو نہیں، گوز بخش۔"
"لیکن میں انھیں دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"دیٹ از رانگ گوز بخش۔"
"تم کون ہوتی ہو، مجھے غلط اور ٹھیک بات بتانے والی؟"

"آئی ایم یور سسٹر۔"

"میں تمھیں اس رشتے سے نہیں پہچانتا۔"

"مجھے مت پہچانو لیکن اپنا فرض تو پہچانو۔"

"میں جانتا ہوں میرا فرض کیا ہے۔" اس نے کھیج کر کہا۔

"خاک جانتے ہو؟"

"تمھارے اس سہگل سے زیادہ جانتا ہوں جس سے رات دن چمٹی رہتی ہو۔"

"گورنحش۔ بی ہیو یور سیلف!" وہ غصے سے بولی۔

"گو ٹو ہیل!" وہ چیخا۔

سرجو کے من میں تو آیا کہ زنّاٹے دار تھپڑ جڑ دے گورنحش کے گال پر۔ لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سچوایشن کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن سچوایشن سدھری نہیں۔

جن لوگوں کو گورنحش کو دیکھنے آنا تھا وہ تو سمے پر آگئے تھے۔ ماسٹر جگدیش رائے ان کی پتنی اور سرجو تو موجود تھے لیکن گورنحش عین وقت پر غائب ہو گیا تھا۔

وہ لوگ دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے اور پھر چائے پی کر چلے گئے۔ یہ وعدہ کر گئے تھے کہ وہ پھر کسی روز آجائیں گے۔

لیکن اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئے۔

ماسٹر جگدیش رائے جیسے آدمی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ اس کی تاب نہ لاسکے اور ایک صبح جب وہ بیڈ ٹی لے رہے تھے، انھیں بڑا شدید دل کا دورہ پڑا۔ اس وقت ان کے پاس صرف سرجو تھی اور کوئی نہیں تھا۔

اس نے اسی وقت ساتھ کے گھر سے آنند کو ٹیلی فون کیا اور وہ ٹیکسی لے کر فوراً ہی آگیا۔

جب تک سرجو کی ماں مندر سے واپس آئی ماسٹر جگدیش رائے کو پی جی آئی

کے ایمرجینسی وارڈ میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔
جب تک ماسٹر جی اسپتال میں رہے آنند ہر روز صبح شام ان کو دیکھنے جاتا رہا اور ڈاکٹروں سے بھی ملتا رہا۔ پی جی آئی کے کئی ڈاکٹر تو اس کے دوست بھی تھے۔
ایک شام جب ان کے سپیشل رُوم میں اور کوئی نہیں تھا تو ماسٹر جگدیش رائے نے آنند سے کہا۔
"آپ کی نظر میں کوئی اچھا لڑکا ہو تو بتایئے۔"
"سرجو کے لیے؟"
"ہاں۔"
"کیسا لڑکا چاہتے ہیں آپ؟"
"جیسا لڑکا سرجو کو پسند ہو۔ اب تو وہ دو سال سے آپ کے ساتھ کام کر رہی ہے آپ بھی تو اس کی پسند اور ناپسند کو جان گئے ہوں گے۔"
اگلے دن جب سرجو "ویژن" کے دفتر جانے سے پہلے اس کے فلیٹ میں آئی تو آنند نے کہا۔
"تمھیں شادی کے لیے کیسا لڑکا پسند ہے؟"
"ڈیڈی نے آپ کو بھی اُلجھا لیا اس مسئلے میں؟"
"کل شام کہہ رہے تھے۔"
"کیا کہہ رہے تھے؟"
"کہ تمھارے لیے کوئی لڑکا دیکھوں۔"
"تو دیکھا آپ نے؟"
"تم سے بات کر کے ہی تو معلوم ہوگا کہ تم کس طرح کا لڑکا چاہتی ہو۔"
"آپ کو ابھی تک معلوم نہیں ہوا؟"
"نہیں۔"

"اچھا تو آپ بتایئے آپ کو کیسی لڑکی پسند ہے؟"
"میرا کیا، مجھے تو سبھی لڑکیاں پسند آجاتی ہیں۔"
"اور کیا بھی کیا ہے آپ نے اب تک۔ آپ کی لینڈ لیڈی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"
"کیا کہتی ہے وہ؟"
"ایک دن کہہ رہی تھی کہ یہ آدمی ساری عمر اسی طرح بھٹکتا رہے گا۔ اسے کوئی لڑکی پسند نہ آئے گی اور یہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔"
"کتنی ٹھیک رائے ہے مسز ورما کی!" آنند زور سے ہنسا۔
"تو آپ کبھی شادی نہیں کریں گے؟"
"میری عمر اب پینتالیس کے لگ بھگ ہے، شادی کی عمر نکل چکی ہے۔"
"سب کی عمر تو نہیں نکل چکی۔"
"جلدی فیصلہ نہیں کرو گی تو تمھاری عمر بھی نکل جائے گی۔"
"تو کیا فیصلہ کروں؟"
"یہ بتاؤ کہ تمھیں کس قسم کا ہسبینڈ چاہیے۔ تاکہ اس کی تلاش کی جائے۔"
"میں نے تلاش کر رکھا ہے؟"
"تو بتا کیوں نہیں دیتیں، میں تمھارے ڈیڈی سے بات کرلوں۔"
"ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب وقت آئے گا تو میں خود ہی بات کروں گی؟"
"کب آئے گا وہ وقت؟"
"آپ کو بھی بتادوں گی، اطمینان رکھیے۔" پھر لمحہ بھر کے بعد وہ بولی
"نہ کام نہ دھندا۔ دوسروں کے معاملوں میں ٹانگ اڑاتے رہو اور اپنا کوئی کام نہ کرو۔"
"کون سا کام نہیں کیا میں نے؟"

"اپنا کالم لکھ لیا؟"

"ابھی نہیں لکھا۔"

"کل اخبار پریس میں جانا ہے، معلوم ہے آپ کو۔"

"معلوم ہے۔"

"خاک معلوم ہے۔ دن بھر بیئر پیتے رہیے اور ٹیلی فون کا ڈائل گھماتے رہیے۔"

"تو اور کیا کروں؟"

"آپ کے گورنمنٹ ہاؤس کی ایلاٹ مینٹ کی بات تھی۔ آپ ملے چیف کمشنر سے؟"

"تمہارے بغیر کیسے مل سکتا ہوں؟"

"اور تو دنیا بھر کے کام آپ میرے ہی ساتھ رہ کر کرتے ہیں؟" سرجو ناراضی کے انداز میں بولی۔

"لگتا ہے گھر میں جھگڑا کر کے آئی ہو۔"

"میں تو ہوں ہی جھگڑالو۔ سبھی سے لڑتی رہتی ہوں۔"

سرجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کتنا کٹھور اور بے نیاز ہے یہ آدمی۔ کسی کی بھاؤناؤں کا خیال ہی نہیں اسے۔ بس اپنی سنک میں مست ہے۔ دوسرے چاہے مریں چاہے جئیں، اس کی بلا سے۔ پھر بھی کتنا اچھا ہے!

یہ سوچتے سوچتے جب ایک بار گیلی پلکیں اُٹھا کر سرجو نے آنند کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آنند کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

"آئی لو یو آنند صاحب!"

اور پھر اس نے اپنے آپ کو آنند کی آغوش میں ڈال دیا اور آنکھیں بند

کرلیں۔ آنند اس کے گال سہلاتا رہا اور اس کی بند آنکھوں کو نہارتا رہا۔

اصل بات جس کا فیصلہ سرجو کرنا چاہتی تھی اور جس کے بارے میں پچھلے دو سال سے سوچتی آرہی تھی، آج بھی ٹل گئی تھی۔

وہ بات ٹلتی ہی گئی۔

آنند ٹھیک ایک سٹیج پر پہنچ کر بدک جاتا تھا۔

اس نے صاف لفظوں میں تو نہیں لیکن مبہم انداز میں کئی بار یہ بات سرجو پر واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ سرجو اسے پسند نہیں تھی۔ سرجو ہر لحاظ سے اچھی لڑکی تھی لیکن یہ اس کا اپنا کمپلیکس تھا کہ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی کا انتخاب تو وہ جب کرے جب شادی کرنے کا فیصلہ کرلے۔

بس اسی کارن بات ٹلے جارہی تھی۔

اور اب ایک طرح سے سرجو بھی فرسٹیٹ ہونے لگی تھی۔

ادھر اس کے بھائی گورنخش نے اپنے ماں باپ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جب تک اپنی شادی کی بات نہیں کرے گا جب تک سرجو کی شادی نہیں ہوجاتی۔

اس کے سامنے اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو وہ سرجو کو آنند سے الگ کرنا چاہتا تھا جس سے اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ سرجو کی شادی ہوجائے گی تو یہ مسئلہ خودبخود ہی سلجھ جائے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی کے بعد وہ ماں باپ کی جائداد کا مالک بن جائے گا اور اپنے ڈیڈی سے جو کچھ چاہے گا وصیت میں لکھوالے گا۔ ماسٹر جگدیش رائے اسپتال سے واپس آکر ایک دم مایوس سے ہوگئے تھے اور ان پر بے نیازی کا عنصر غالب آنے لگا تھا۔ گورنخش کی کوشش یہ بھی تھی کہ سرجو کی شادی ہو بھی چنڈی گڑھ سے باہر۔ پھر نہ تو وہ آنند سے مل سکے گی اور نہ ہی ماں باپ کے گھر سے اس کا اتنا تعلق رہے گا۔ گورنخش تو بلکہ سرجو کی شادی کے جھوٹے سچے پروپوزل بھی لاتا رہتا تھا جنھیں سرجو ایک دم اگنور کردیتی تھی۔

اس سے گورنخش کی جلن اور بڑھتی تھی اور وہ زیادہ شدت سے اپنے

منصوبوں کو عملی روپ دینے کے طریقے سوچتا رہتا تھا۔
سرجُو کے خیال کے مطابق آنند کے دو کام ہونے بہت ضروری تھے۔ ایک تو ٹیلی فون کنیکشن اور دوسرا گورنمنٹ ہاؤس کی ایلاٹمنٹ۔
آنند ویسے تو دنیا بھر کے کاموں میں اُلجھا رہتا تھا لیکن اپنا ذاتی کام اُس سے ایک بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے بھی سرجُو ہی بھاگ دوڑ کرتی۔
آج آنند کا ایک کام پورا ہو گیا تھا۔
اسے ٹیلی فون کنیکشن مل گیا تھا۔
وہ خدا کا بندہ آج بھی اپنے فلیٹ میں موجود نہ تھا۔ جانے کہاں کہاں بھاگتا پھر رہا تھا۔ ٹیلی فون ڈیپارٹمینٹ کے آدمی صبح سے تین چکر لگا چکے تھے۔ اس کی لینڈ لیڈی، مسز ورما بھی بہت ناراض تھیں۔
دوپہر کے بعد جب سرجُو "ویژن" کے تازہ اشو کے لیے کچھ ضروری کاغذ لینے آنند کے فلیٹ پر آئی تو ٹیلی فون کے آدمی آخری بار چکر لگا کر جانے والے تھے۔ سرجُو نے تالے کی دو چابیاں بنوا لی تھیں اور فلیٹ کے تالے کی ایک چابی وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ اس نے جب سیڑھیاں چڑھ کر فلیٹ کا دروازہ کھولا تبھی اس نے ٹیلی فون اِنسٹال کرنے والے آدمی کو دیکھا۔
"بہت دیر سے آئے ہو آپ لوگ، آپ کو تو کل آنا تھا۔"
"میڈم ہمارے پاس انسٹرومینٹ اچھا نہیں تھا۔ آج سٹور سے نیا انسٹرومینٹ اِشو کروا کر آئے ہیں، ہم لوگ۔"
"تو پھر صبح جلدی آجاتے نا۔"
"ہم تو صبح سے تین چار چکر لگا چکے ہیں۔ یہ ہمارا چوتھا چکر ہے۔"
"سہگل صاحب نہیں ملے؟"
"ہر بار دروازہ بند تھا۔ نیچے والی میم صاحب سے پوچھا تو انھوں نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"اس آدمی کی اپنی ہی مایا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

"آپ کو بھی نہیں؟"

"کسی کو نہیں بھائی۔ اب میں گھر ہی پر ہوں۔ آپ ٹیلی فون کنیکشن دے دیں آج۔"

"آپ سے ٹیلی فون پر بات کروا کر جائیں گے۔"

"شاید تب تک تو سہگل صاحب بھی آجائیں۔"

"سُنا ہے بہت بڑا اخبار ہے ان کا؟"

"ہے تو سہی۔"

"آپ بھی اسی اخبار میں کام کرتی ہیں۔ دونوں ہی؟" تینوں آدمیوں میں سے یہی سینئر آدمی تھا شاید، جو اس سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں، دونوں ہی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

سرجو اپنے کاغذ تلاش کرتی رہی اور ٹیلی فون کے آدمی سڑک پر اس مکان کے سامنے والے کھمبے پر چڑھ کر ٹیلی فون کے تار کھینچتے رہے۔ سرجو کو معلوم ہی نہیں تھا کہ آنند انسٹرومینٹ کہاں رکھوانا چاہے گا۔ اس نے اپنے آپ ہی فیصلہ کر کے ٹیلی فون اندر والے کمرے میں رکھوا دیا، جو آنند کا سونے کا کمرہ بھی تھا اور اس کا اسٹڈی روم بھی، جسے وہ اپنی ورکشاپ کہا کرتا تھا۔

شام کو جب آنند آیا تو ٹیلی فون والے آدمی جا چکے تھے۔

سرجو بھی تھک گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے آنند کے پلنگ پر لیٹ گئی تھی اور کوئی دس پندرہ منٹ کے لیے اونگھ بھی گئی تھی۔ وہ دروازہ بھی اندر سے بولٹ کرنا بھول گئی تھی۔ اسے پتا بھی نہ لگا کہ آنند کب آیا تھا اور کب پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

سرجو کی آنکھ کھلی تو وہ بنا یہ جانے کہ آنند بھی کمرے میں موجود تھا، اپنے آپ سے مخاطب ہو رہی تھی۔

ایسا بے ڈھنگا آدمی اور بھی کوئی ہوگا دنیا میں؟
جسے نہ اپنی سُدھ ہے نہ کسی دوسرے کی۔
اگر اس کا خیال رکھنے والا کوئی دوسرا دیکتی نہ ہو تو یہ ڈھنگ سے جی بھی نہ سکے۔ اور اسے کسی بھی سمبندھ میں وشواس نہیں، چاہے وہ کتنا ہی گہرا اور اٹوٹ کیوں نہ ہو۔ وہ ہر سمبندھ کو ارتھ ہین سمبندھ سمجھتا ہے۔
او گاڈ!

وٹ اے فولش گرل آئی ایم!
وہ پلنگ سے اٹھنے لگی تو اس کی نظر آنند پر پڑی، جو بڑے مزے سے اسے خاموش گھورے جا رہا تھا۔
"آپ نے یہ سب سُن لیا؟"
"میں نے تو اپنے کانوں میں روئی دے رکھی تھی۔" وہ زور سے ہنسا۔
"کب آئے؟"
"آیا ہی کہاں ہوں ابھی۔"
"ٹیلی فون لگ گیا ہے۔"
"دیکھ رہا ہوں۔"
"یہیں رکھوانا چاہتے تھے نا ٹیلی فون، آپ؟"
"کتنے ٹیلی فون کیے ہیں اب تک؟"
"ایک بھی نہیں۔ آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"
"تو اب کرو۔"
"کسے کروں؟"
پھر اس نے بلجندر کے ٹیلی فون کا نمبر گھمایا۔ وہ کچھ دنوں سے اپنے پیرنیٹس کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اس کا ہسبینڈ راجوری میں پوسٹڈ تھا۔
"کڈ آئی سپیک ٹو بلجندر؟"

"پلیز ہولڈ اون
اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد بلجندر بولی۔
"کون؟"
"سرجُو!"
"رئیلی۔ کہاں سے بول رہی ہو؟"
"آنند صاحب کے گھر سے۔ آج ہی انھیں ٹیلی فون کنیکشن ملا ہے۔ پہلا ٹیلی فون تمھیں ہی کر رہی ہوں۔"
"ہاؤ سوئیٹ۔ کہاں ہیں تمھارے سوئیٹ ہارٹ؟"
"ڈاونٹ بی سلی۔"
"کب مل رہی ہو؟"
بس ایک آدھ دن میں۔ ہاؤ از یور چائلڈ؟"
"فائن۔"
اور پھر ٹیلی فون کٹ گیا۔ نیا نیا ٹیلی فون، ایسی حرکتیں تو کرتا ہی ہے۔
سرجُو اُٹھ کر باہر چلی گئی، آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے کے لیے۔
سرجُو کو آنکھوں پر ٹھنڈا پانی پھینکنے کی بڑی سنک تھی۔ دن میں جانے کتنی بار آنکھیں دھوتی تھی وہ۔ ایک دن آنند نے ٹوکا تھا۔
"کتنی بار پانی کے چھینٹے مارتی ہو آنکھوں پر، سارے دن میں؟"
"میں نے کبھی آپ سے پوچھا ہے کہ آپ دن میں کتنی بار برش کرتے ہیں۔
"جب دیکھو دانت صاف ہو رہے ہیں۔"
"صاف بھی کتنے ہیں میرے دانت۔ بالکل سچے موتیوں کی طرح۔"
"خاک صاف ہیں۔"
"اور تمھاری آنکھیں ہیں کہ دن میں اتنی بار دھونے کے بعد باوجود گدلے تالاب کی طرح ہیں۔"

"آنکھیں تالاب کی طرح نہیں جھیل کی طرح ہوتی ہیں۔"

"سمندر کی طرح کیوں نہیں ہوتیں؟"

"سمندر میں نمک بہت ہوتا ہے۔"

"دیکھا ہے تم نے کبھی سمندر؟"

"سمندر جیسا آدمی ضرور دیکھا ہے۔"

"کہاں؟"

"سپنے میں۔"

یہ کہہ کر سرجُو بہت زور سے ہنسی تھی اور آنند کو لگا تھا کہ سرجُو کی آنکھوں کو بار بار دھونے سے وہ تو چمکتی ہی تھیں۔ لیکن اس کی ہنسی بھی چمکتی تھی۔ آکاش کے عین درمیان نکھرتی چاندنی کی طرح۔ ٹھنڈی مدھر اور نشہ گھولتی ہوئی، چاروں کھونٹ!

سرجُو کے کمرے سے باہر نکلتے ہی۔ سیڑھیوں کے پاس والا دروازہ کھُلا اور مسز ورما داخل ہوئی۔

"ہوگیا تمہارے ٹیلی فون کا اُدگھاٹن؟"

"وہ تو آپ کو کرنا ہے مسز ورما۔"

"ابھی تو ٹیلی فون پر بات کر رہی تھی وہ چھوکری۔"

"چھوکری نہیں، سرجُو، مسز ورما" سرجُو نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔"

"وہ تو ٹرائل کال تھی۔ اُدگھاٹن تو آپ ہی کریں گی۔" وہ بولی

"کیا یہ ٹھیک کہہ رہی ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، مائی ڈیئر، مائی ونڈر فل لینڈ لیڈی۔"

"مسکا کاہے کو لگا رہے ہو، شراب پلانے کے لیے۔"

"تو مسز ورما۔ آج تو ٹیلی فون کا اُدگھاٹن ہے۔ آج کوئی پاپ کا کام نہ ہوگا۔ وہ بعد میں دیکھیں گے۔ آپ ڈائل گھمائیے۔"

"دہلی کا کوڈ نمبر کیا ہے؟"

"ناٹ ون ون۔"

"دہلی کریں گی ٹیلی فون؟"

"ہاں، اپنی سسٹر کو۔"

پھر مسز ورما نے اپنی بہن کا نمبر گھمایا اور پھر اس سے بات کرنے لگی۔

"اُدگھاٹن کر رہی ہوں ٹیلی فون کا۔"

"تم نے ٹیلی فون لگوا لیا ہے؟"

"ہاں دوسروں کے ٹیلی فون گھمانا اچھا نہیں لگتا ورما صاحب کو۔"

"تمھیں تو لگتا ہے۔"

"مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ دوسروں کے ٹیلی فون کے ڈائل گھمانا۔"

"اب تو اپنے ٹیلی فون کا ہی ڈائل گھمایا کروگی!"

"نہیں دوسروں کا ہی گھمایا کروں گی۔"

"تمھیں کیا ضرورت تھی ٹیلی فون لگوانے کی۔ بیکار کی فضول خرچی ہے۔"

"میں نے ٹیلی فون کنیکشن بیچ دیا ہے۔"

"کسے؟"

"اپنے کرایے دار کو۔"

"کون ہے وہ؟"

ایک جرنلسٹ ہے۔ بہت ہی خوبصورت اور بیچلر بھی۔"

"پھر تو تمھارے مزے ہیں۔"

"تم آجاؤ تو تمھارے مزے بھی کراؤں۔"

اس جواب پر آنند اور سرجو زور زور سے ہنسنے لگے۔

"یہ کون لوگ ہنس رہے ہیں؟"

"وہی جرنلسٹ اور اس کی ایک گرل فرینڈ۔"

ٹیلی فون پھر کٹ گیا۔ نئے ٹیلی فون کنیکشن کا ایک اور معشوقانہ انداز!

اور جب آنند اپنے لیئے اور مسز ورما کے لیے ڈرنک بنا رہا تھا اور سرجو فرج سے برف نکال رہی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ہوئی۔ یہ پہلی باہر کی گھنٹی تھی۔

"کوئی ٹرائل کال ہوگی، ایکسچینج والوں کی" اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے ریسیور اُٹھایا۔

"ازاٹ آنند؟"

"یس"

"میں وجینتی ہوں"

"ہاؤ نائیس آف یو۔ ٹیلی فون کا نمبر کہاں سے ملا؟ مجھے تو خود نہیں معلوم اپنا نمبر"

"ایکسچینج والوں نے ملایا ہے تمہارا نمبر۔ میں نے سوچا نئے ٹیلی فون کی مبارک دے دوں"

"تھینک یو وجینتی"

تمھاری اسسٹنٹ ایڈیٹر کہاں ہے؟"

"یہیں ہے۔ بات کراؤں؟"

"نہیں۔ اس کو تم اس کے گھر نہیں جانے دیتے؟"

"کیوں نہیں جانے دیتا؟ وہ اپنے ہی گھر میں تو رہتی ہے"

"ڈاونٹ ایکسپلائٹ ہر"

"تھینکس فار دی ایڈوائیس"

ٹیلی فون پھر کٹ گیا۔ نئے کنیکشن کا ایک اور کرشمہ!

"کتنی برف ڈالوں؟" آنند نے وسکی کا گلاس مسز ورما کو پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

"برف ہی تو پیتی رہی ہوں، ساری عمر۔ آگ ڈالو اس میں"

"پگھلی ہوئی آگ ہی تو ہے گلاس میں" آنند ہنسا۔

"اچھا تو پھر تھوڑی برف بھی ڈال دو۔"

آنند نے مسز ورما کے گلاس میں برف کے کچھ ٹکڑے ڈالے اور پھر اپنے گلاس میں برف کے کچھ ٹکڑے ڈالنے لگا۔ کئی ٹکڑے ڈال دیئے اُس نے۔

"تم تو بڑی برف پیتے ہو۔" مسز ورما نے کومینٹ کیا۔

"میں نے آگ بھی تو بہت پی ہے۔"

"آپ جتنی باتیں کرتے ہیں، اتنا کام بھی کریں تو کہیں کے کہیں پہنچ جائیں۔" سرجو نے ذرا کڑائی سے کہا۔

دو سال سے زیادہ سمے آنند کے ساتھ رہنے سے اس نے کم سے کم یہ سیکھ لیا تھا کہ جب دوسرے لوگ وسکی پی رہے ہوں تو تم اپنے گلاس میں نیبو پانی لے کر اُسے ہی سِپ کرتے رہو۔

"تم نے اس سٹوپڈ آدمی سے کچھ نہیں سیکھا اب تک؟"

"سٹوپڈی سیکھ رہی ہے تھوڑی۔"

"مجھے تو اس میں بھی شک ہے۔"

"آپ بہت شکی مزاج ہیں، مسز ورما۔"

"مجھ سے زیادہ شکی مزاج میرے ہسبینڈ ہیں۔ ان کا ایک فرینڈ انھیں زبردستی کھینچ کر ساتھ لے گیا ہے آج وہ بالکل باہر نہیں جانا چاہتے تھے۔"

"کیوں؟"

"انھیں شک تھا کہ تم مجھے ٹیلی فون لگ جانے کی خوشی میں وسکی ضرور پلاؤ گے۔"

"آپ نے تو بہت بدنام کر رکھا ہے مجھے؟"

"بدنام تو تم اپنی حرکتوں سے ہو۔"

"ٹھیک کہ رہی ہیں آپ۔ سرجو نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ اتنے بُرے ہیں نہیں، جتنے بُرے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"بُرا تو ہوں ہی نا؟"

"اس میں کیا شک ہے۔" سرجو بولی۔

"کوئی اور سرٹیفکیٹ چاہیے؟ میرا سرٹیفکیٹ تو تمھیں پہلے ہی مل چکا ہے۔"

مسز ورما آج بہت جلدی سے نہیں پی رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے پی رہی تھیں اور اس لیے انھیں چڑھ بھی آہستہ آہستہ ہی رہی تھی۔

"گلاس ختم کیجیے تو تھوڑی وسکی اور ڈالوں۔"

"پھر جب مجھے نشہ ہو جائے گا تو کہوگے چلو آپ کو نیچے تک چھوڑ آؤں، کہیں پاؤں نہ پھسل جائے سیڑھیوں سے۔"

"یہ تو کہوں گا ہی۔" آنند مسکرایا۔

"لاؤ تالا کھول دوں، آپ کا ہاتھ جم نہیں رہا، ٹھیک سے، پھر یہ کہوگے۔

"تالا تو کھولوں گا ہی۔"

"پھر کہوگے، چلو آپ کو بستر تک پہنچا دوں۔"

"یہ شاید نہیں کہوں گا۔"

"تم اس کے قابل ہی نہیں دراصل۔" مسز ورما ہنسنے لگی۔

آنند نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر اسے زور سے چوم لیا۔

"آپ کے ہاتھ کتنے نرم ہیں!"

"بس تمھاری لمٹ یہیں تک ہے۔ اس سے آگے تم نہیں بڑھ سکتے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے، مائی سوئیٹ ڈیر مسز ورما؟"

"مرد کے ایک ٹچ سے ہی عورت مرد کو اندر باہر، پوری طرح سے پڑھ لیتی ہے۔"

"آپ کا یہی اندازہ ہے میرے بارے میں؟"

"اندازہ نہیں، فیصلہ ہے۔ تم نہایت ناتجربہ کار آدمی ہو یا پھر بہت پوز کرتے ہو۔"

آنند نے مسز ورما کے ہاتھ کو زور سے دبا کر اسے ایک بار پھر چوم لیا۔

جب وہ دوسرے پیگ کے کچھ سپ لے چکی تو مسز ورما نے کہا۔
"یہ ٹیلی فون میرا ہے یا تمھارا؟"
"آپ کا ہے مسز ورما۔"
"کیسے؟"
"کیونکہ استعمال تو اسے آپ ہی کریں گی۔ میں تو گھر پر ہوں گا نہیں۔ فلیٹ کی چابی بھی آپ ہی کے پاس رہے گی۔"
"اور یہ فلیٹ؟"
"یہ بھی آپ کا ہے۔ دراصل ٹیلی فون، گھر اور عورت اُسی کے ہوتے ہیں جو انھیں استعمال کرتا ہے۔"
"یہ بات تو گھڑی اور کار کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔"
"گھڑی اور کار آپ کو عین وقت پر ڈِچ کر سکتی ہیں۔"
"اور ٹیلی فون، گھر اور عورت؟"
"یہ آپ کو ڈِچ نہیں کرتے، آپ کا صبر آزماتے ہیں۔"
مسز ورما نے وسکی سے بھیگے ہوئے ہونٹ آنند کے گال پر رکھ دیئے۔
"اس لڑکی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"
"یہ میرا صبر بھی آزمائے گی اور مجھے ڈِچ بھی کرے گی۔"
"آنند صاحب۔ آپ وسکی پینا چھوڑ دیجیے اب۔ بہت جلدی چڑھنے لگتی ہے آپ کو۔"
"دیکھا مسز ورما۔ جو آدمی سچی بات کہہ دے لوگ اسے شرابی کہنے لگتے ہیں۔"
"مسٹر ورما سے بھی کبھی کبھی میرا یہی جھگڑا ہوتا ہے۔"
اور ٹھیک اسی لمحہ دروازے پر چھڑی سے کھٹکا ہوا۔
"لو آ گئے ورما صاحب۔ یہ گلاس دوسرے کمرے میں رکھ دو، پھر دروازہ کھولنا۔"

آنند دونوں گلاس لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور سرجو نے دروازہ کھولا۔
"آنند کہاں ہے ؟" انھوں نے اونچی آواز میں کہا۔
"حاضر ہو رہا ہوں حضور ۔" وہ اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے اور رومال سے ہونٹ پونچھتے ہوئے دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔
"بیٹھیے سرکار!" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔
"کہاں رہے تم اتنی دیر ؟" مسزِ ورما نے پوچھا۔
"گپتا ہی کے ساتھ تھا۔ میں نے سوچا تم نے کئی ٹیلی فون کرنے ہوں گے۔ کر چکو تو گھر آؤں ۔"
"میں نے دہلی ٹیلی فون کیا ہے ؟"
"پرتبھا کو ۔"
"ہاں، تمھیں بہت یاد کر رہی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا کہ اتنے دنوں کے بعد میں نے اسے ٹیلی فون کیا۔"
"ٹیلی فون کے علاوہ بھی کچھ ہوا ؟"
"ہاں ذرا سا جشن بھی۔ چھوکری، ورما صاحب کا مُنہ تو میٹھا کراؤ ۔"
مسزِ ورما نے سرجو سے کہا۔
سرجو پل بھر میں پلیٹ میں مٹھائی رکھ کر لے آئی۔ مسٹر ورما نے بس ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔
"وسکی کے بعد میٹھی چیز نہیں لینی چاہیے ۔"
"آپ کو کیسے معلوم ہے ورما صاحب ؟" آنند نے پوچھا۔
"بھئی، ہم نے بھی تمھاری لینڈ لیڈی سے ہی سیکھا ہے یہ سب ۔" پھر وہ ہنسنے لگے۔ ورما صاحب کی ہنسی میں آنند اور سرجو تو شامل ہو گئے لیکن مسز ورما بالکل بھی نہیں ہنسی۔
"نیچے چل کر جواب دوں گی اس کا ۔"

"جواب تو ہمیں یہیں مل گیا۔ نیچے تو اب سوال ہی ہوں گے۔
پھر سب لوگ ہنس پڑے اور ہنسی کی اس فضا میں مسٹر ورما اور مسز ورما سیڑھیاں اترنے لگے، دھیرے دھیرے۔
"میں ساتھ چلوں، ورما صاحب؟"
"تمھارے ساتھ چلنے سے میرا بچاؤ نہیں ہوگا۔"
آنند اور سرجو زور سے ہنسے اور مسز ورما کا پاؤں پھسلتے پھسلتے مشکل سے سنبھلا۔
کمرے میں واپس آکر سرجو نے بڑی تلخی سے کہا۔
"میں آپ سے پیار کرتی ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ دوسروں کے سامنے میرا اپمان کریں۔"
"میں نے اپمان والی کیا بات کہی ہے؟"
"آپ کو تو اپنی کہی ہوئی کوئی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ میں کیا کروں؟"
آنند نے سرجو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔
"لگتا ہے، آج بہت ناراض ہو؟"
"آپ تو عورتوں سے فلرٹ کیجیے چاہے وہ کسی عمر کی ہوں، چاہے کسی سٹیٹس کی اور دوسروں کی کھلّی اُڑائیے
"کسی کی کھلّی اڑا رہے ہیں تے؟"
"میری!" سرجو نے اونچی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
پھر وہ روکھی آواز میں بولی۔
"میں آپ کا صبر بھی آزما رہی ہوں اور آپ کو ڈچ بھی کرنے والی ہوں۔"
آنند نے سرجو کی بات سنی۔ پھر اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھایا اور کہنے لگا۔
"تم کہا کرتی ہو نا کہ تمھاری 'تیسری آنکھ' بھی ہے۔ جو کچھ تمھیں دو آنکھوں سے

نظر نہیں آتا اُسے تم اپنی تیسری آنکھ سے دیکھ لیتی ہو۔ جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں۔"

"میری بات تو سُن لو پوری طرح۔ جس طرح تمھارے پاس تیسری آنکھ ہے، اسی طرح میرے پاس کالی زبان ہے۔ اور جو میں کہتا ہوں وہ بالکل سچ ہوتا ہے۔"

"تو آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہی کہ تم میرا صبر آزماتی رہو گی عمر بھر اور مجھے چھوڑ جاؤ گی۔"

"میں آپ کی کالی زبان کاٹ ڈالوں گی۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنند کی گردن پر رکھ دیئے بڑے زور سے۔

"تم میرا گلا مت دباؤ۔ بس زبان کاٹ دو۔"

سرجو نے اس کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیے اور پھر اپنے آپ کو آنند کی آغوش میں ڈال کر سسکنے لگی۔

"لیکن زبان کاٹ دینے سے سچائی تھوڑی کٹ جائے گی۔"

آنند نے اس کا بایاں ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے کر لیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کہنے لگا۔

"اسی سال کے انت تک تمھاری شادی ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"کس سے؟"

"مجھ سے نہیں۔ کسی انجانے آدمی سے۔ اچانک۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟" سرجو نے آنسوؤں سے نچڑتی اپنی آنکھیں آنند کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"تمھیں معلوم ہے میں، نمبرز کی سائنس، پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ میں جب بھی کسی شخص سے ملتا ہوں اس کے برتھ ڈے کے مطابق اپنی کیلکولیشن کرتا ہوں اور مجھے اس شخص کی زندگی کا جنرل پیٹرن معلوم ہو جاتا ہے۔ تمھاری کیلکولیشنز بھی تو کی تھیں میں نے۔"

"ہاں، لیکن بتایا کچھ نہیں تھا۔"

"بتا بھی دیتا تو تم مجھ پر یقین نہ کرتیں۔ حالانکہ کچھ کچھ سنکیت میں نے کر بھی دیئے تھے۔"

"آپ اپنی کالی زبان سے کہتے جایئے، جو کچھ آپ کو کہنا ہے۔"

"تمھارا میرے ساتھ رہنا کچھ سمے تک میرے لیے بہت اچھا ہوگا، لیکن اس کے بعد میرے ستارے تمھارے لیے اچھے ثابت نہ ہوں گے۔"

"کہتے جایئے۔ آپ کو کھلی چھٹی ہے۔"

"تم پر تمھارے گھر والوں کے ستارے زیادہ اثرانداز ہوں گے اُس وقت۔ اور تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔"

"کیوں چھوڑ جاؤں گی؟"

"اتنا سب میں نہیں جانتا۔ اتنا گیان مجھ میں نہیں ہے۔"

"اور کیا ہے آپ کے پاس؟"

"دنیا بھر کا اگیان اور جھوٹ؟"

"مسز ورما کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس کی لائف لائن اب بہت دُور تک نہیں جائے گی۔"

"وٹ اباوٹ مائی ڈیڈی؟"

"پھر بتاؤں گا۔ کیلکولیشنز کر کے؟"

"اور کیا کہتی ہے آپ کی کالی زبان؟"

"اور یہ کہتی ہے کہ ملک کے حالات بگڑ جائیں گے ایک آدھ سال کے بعد، بہت ٹریجڈیز ہوں گی۔ بڑی اُتھل پتھل ہو گی سنسار بھر میں۔"

"اور؟"

"میرا "ویژن" والا پروجیکٹ ناکامیاب ہو جائے گا۔ میں جرنلزم چھوڑ کر کوئی اَور کام کروں گا۔"

"پھر؟"
"اس فیلڈ میں میرا بہت نام ہو جائے گا، بالکل اچانک۔"
"اس کے بعد؟"
"مجھے کئی بڑے بڑے ایوارڈ ملیں گے۔ اور جس روز سب سے بڑا ایوارڈ ملنے والا ہوگا، اس سے کچھ سمے پہلے میں مر جاؤں گا۔"
"بکواس کرتے ہیں آپ؟" سرجو چیخی۔
"اور اپنے پیچھے ان پرنٹڈ کتابوں کے علاوہ رائیلٹی کی بہت ساری رقم چھوڑ جاؤں گا، جسے کوئی بھی وصول نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کہ میرا کوئی وارث نہیں ہوگا۔"
آنند نے اپنی بات ختم کر کے، پیٹھ صوفے کی بیک کے ساتھ لگا دی۔
"رُک جایئے۔ میں ابھی کاٹتی ہوں آپ کی یہ منحوس کالی زبان!"
وہ صوفے سے اُٹھ کر کچن کی طرف لپکی اور واقعی ایک چمکتی ہوئی تیز چھری اُٹھا لائی۔ آنند نے اپنی لال سرخ زبان منہ سے نکال کر، سرجو کے سامنے کر دی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آج ہی کٹ جائے اس کی زبان۔ ختم ہو یہ جھنجٹ بھی!
اسی کھنشن اسے چھری کے فرش پر پھینکنے کی آواز آئی اور سرجو نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔
"آئی لو یو آنند!" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔
بہت زمانے کے بعد آج پہلی بار آنند پھپھک کر رو پڑا اور سرجو کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے بولا۔
"مجھے معاف کر دو سرجو۔ آئی ایم اے سٹوپڈ پرسن۔"
دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی ریسیور نہیں اُٹھایا۔ گھنٹی رُک رُک کر دو تین بار بجی اور پھر خود ہی بند ہو گئی۔
سرجو چلی گئی تو اس نے گلاس میں اور وسکی ڈالی اور دو تین گھونٹ تو

بنا سوڈا ملائے ہی پی گیا۔ مسز ورما کے گلاس میں وسکی بچی پڑی تھی وہ اس نے کواڑ کی جالی پر پھینک دی، کچھ وسکی باہر برآمدے میں گری، کچھ کمرے کے اندر۔ وسکی کے ان چھینٹوں کو فرش پر بکھرے ہوئے وہ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر وہیں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا وہ کئی دفعہ ضرورت سے زیادہ بول جاتا تھا۔ جہاں ضرورت سے کم بولنا خراب ہے وہاں زیادہ بولنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ وہ دیر تک اپنی ٹھوڑی، بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن جیسے ایک دم خالی ہو گیا تھا۔ جیسے اب کچھ بھی نہیں بچا تھا سوچنے کو۔ اس نے جیسے اپنی تمام زندگی کا خلاصہ سرجو کو سنا دیا تھا۔ بلکہ اس کی زندگی کو بھی ادھیڑ کو اس کے سامنے رکھ دیا تھا، بڑی بے شرمی سے۔

گلاس سے ایک سپ اور لے کر وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

— آنند صاحب آپ اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ اور یہی عادت آخر، آپ کی تباہی کا باعث ہو گی۔ آپ کیا زندگی بھر ایسے ہی رہیں گے؟ کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچیں گے اپنے بارے میں، دوسروں کے بارے میں اور زندگی کے بارے میں؟

زندگی کو اس بری طرح ڈسٹرب نہ کیجیے حضور! اگر اس نے پلٹ کر وار کیا تو خاک بھی نہ چاٹ سکیں گے۔ زندگی آپ کو اتنی مہلت نہیں دے گی سرکار!

کچھ تو ہوش کیجیے!

آخر کچھ تو سنبھلیے!! —

آنند کے ذہن کی یہ حالت تھی اس وقت، جب ایک بار ٹیلی فون کی گھنٹی ہوئی، کچھ توقف کے بعد پلنگ کی پٹی سے اٹھ کر اس نے ریسیور اٹھایا۔

"سو رہے تھے کیا؟" وجینتی چلے کی آواز تھی۔

"نہیں صرف اونگھ رہا تھا۔"

"اس وقت ٹیلی فون کٹ گیا تھا۔ اس لیے اور بات نہ ہو سکی تھی۔"

"آج کی سپاٹ نیوز کیا ہے؟"

"یہ کہ آنند سہگل آج کل شراب بہت پیتا ہے۔"

"یہ تو پانچ برس پہلے کی سپاٹ نیوز ہے۔ جب تو تم کیرلا یونی ورسٹی میں ابھی جرنلزم کر رہی تھیں۔" وہ زور سے ہنسا۔

"میں تم سے کچھ سیریس قسم کی بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی؟"

"ہاں اسی وقت۔"

"تو کہو، کیا بات ہے؟"

"تمھارے بہت سکینڈل ہو رہے ہیں آج کل۔"

"میرے سکینڈل تو ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔" وہ پھر ہنسا۔

"میری بات دھیان سے سنو، آنند۔" وجینتی بڑی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"سُن رہا ہوں۔ بولو۔"

"تمھاری اسسٹنٹ ایڈیٹر کا نام کیا ہے؟"

"وہی جو اخبار کے پہلے صفحے پر چھپتا ہے۔"

"سرجو شرما؟"

"ہاں۔"

"اُس کا بھائی تمھارے خلاف وِلی فی کیشن کی پوری کیمپین چلا رہا ہے۔"

"اپنی بہن کو الوا لو کر کے نا؟ ہی از اے فُول۔"

"ہاں اسی کو جوڑ رہا ہے تم سے۔"

"اسے سمجھاؤ کہ اپنی بہن کو الوا لو کیے بغیر میرے خلاف کیمپین چلائے۔ وہ کیمپین زیادہ کامیاب رہے گی۔"

"تم اس چھوکری کو الگ کیوں نہیں کر دیتے" وبژن "سے؟"

"تم کام کرو گی میرے ساتھ! مس وجینتی پلّے۔"
"سوچنا پڑے گا اس کے بارے میں۔"
"کہیں تمھارے بھی سکینڈل نہ ہونے لگیں؟" وہ ہنسا
"جسٹ پاسی بل۔"
اور اسی لمحہ کنیکشن پھر کٹ گیا۔
آنند کو بڑا ریلیف ہوا۔ ورنہ بیکار قسم کی اور ٹینشن بڑھتی۔
اس رات وہ ٹھیک طرح سے سو بھی نہ سکا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بار بار اپنے آپ سے بات کرے۔ اپنے آپ کو کھنگالے، اپنا بھرپور جائزہ لے۔ وہ جتنی دیر بھی سویا اپنے آپ سے مخاطب رہا۔ کبھی کبھی دوسروں کی بجائے خود سے گفتگو کرنا، اپنے آپ سے ہم کلام ہونا، اسے اچھا لگتا تھا۔ کرب خود کلامی کا ایک اپنا مزہ ہے۔ اس کی ایک اپنی لذت ہے۔ ویسی ہی لذت جو کبھی کبھی آدمی اپنے دانت میں ہلکا ہلکا درد ہونے پر محسوس کرتا ہے، جو اسے ایک دم تڑپاتا بھی نہیں اور پوری طرح سے قرار بھی نہیں لینے دیتا۔
بس رات بھر یہی کیفیت رہی آنند کی۔ سوتے میں جاگنے اور جاگتے میں سونے کی کرب آمیز کیفیت!
اس کے بعد بھی دو تین بار وجینتی پلّے سے آنند کی بات ہوئی۔ اس نے یہ تو فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ "ویژن" جوائن نہیں کرے گی۔ لیکن ایک مستقل کالم لکھنے کو تیار ہو گئی تھی وہ۔ جس دن وجینتی پلّے کا "ویژن" میں پہلی بار "سلمز آف چنڈی گڑھ" کے عنوان سے کالم چھپا، سرجو کا ردِ عمل کوئی بہت حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اس نے اس سلسلے میں آنند سے کھل کر تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی۔ اسی دن دوپہر کے بعد وجینتی پلّے "ویژن" کے آفس آئی تھی۔ آنند موجود نہیں تھا۔ وہ ٹیلی فون اس لیے نہ کر سکی تھی کہ آنند نے ٹیلی فون دفتر میں شفٹ نہیں کروایا تھا ابھی۔ دفتر میں سرجو ہی تھی جو اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھی۔ دونوں میں چند نارمل ابتدائی جملوں کے اور

زیادہ گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ وجینتی پلے نے آخر خود ہی پوچھا تھا۔

"ہاؤ ڈُو یُو لائک مائی کالم، سرجُو؟"

"اِٹ اِز ناٹ یُور کالم۔ کالم تو "ویژن" کا ہے؟"

وجینتی کی پہلی ہی بات غلط بیٹھی تھی۔

"یُو آر کریکٹ۔" وہ مسکرائی "میرا مطلب اپنی سٹوری سے ہے۔ کیسی لگی تمھیں؟"

"ابھی پڑھ نہیں پائی پوری طرح۔"

"تو اسے ایڈِٹ کس نے کیا ہے؟"

"آنند صاحب نے خود ہی۔"

"تم سارا میٹریل نہیں دیکھتی، اخبار کا؟"

"کبھی کبھی نہیں بھی دیکھتی۔"

"ٹیل آنند صاحب دیٹ آئی کیم ٹُو سی ہِم۔"

"ضرور۔" سرجُو نے ذرا سا مسکرانے کی کوشش کی۔ اس خیال سے کہ اب تو وہ جا ہی رہی تھی۔ اخلاقی طور پر مسکرانا تو چاہیے اُسے۔

وجینتی جانے کو اُٹھی تو سرجُو کو جانے ایک دم کیوں خیال آیا اسے چائے کے لیے کہنے کا۔

"چائے تو پی لو۔"

"یُونی ورسٹی میں میری ایک اسائینمینٹ ہے۔ آئی ایم اِن اے ہری۔"

سرجُو وجینتی پلے کو باہر تک چھوڑنے ضرور گئی۔ یہ اخلاقی تقاضا تو تھا ہی۔ ویسے بھی وجینتی بہت کم آتی تھی "ویژن" کے آفس میں!

اگرچہ سرجُو کی اور وجینتی پلے کے آپسی تعلقات زیادہ گہرے نہ ہو پائے لیکن وجینتی "سلمز آف چنڈی گڑھ" والا کالم باقاعدگی سے لکھتی رہی۔ پڑھنے والوں کے خطوط سے یہ لگتا تھا کہ لوگوں نے اس کالم کو پسند کیا تھا۔ یہ کالم ایڈٹ بھی آنند خود ہی کرتا تھا۔ سرجُو نے اس کالم کو ایڈٹ کرنے کی ذمّہ داری لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے

خیال سے کہ یہ بڑا سینسی ٹولشو تھا اور اس میں سرجُو کی اور وجینتی پلّے کے پرسینیلٹی کلیش کی بھی سمبھاونا تھی۔ آنند نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ سارا اخبار سرجُو ہی دیکھتی تھی اور پڑھنے والوں کو اخبار کا لے آؤٹ اس کا میٹریل، اس کی پرنٹنگ، اس کا گیٹ اپ سب کچھ پسند تھا۔ آنند کا اپنا ایڈیٹوریل یا لیڈنگ آرٹیکل بہت بولڈ اور خوبصورت ہوتا تھا۔ پریس لابی میں آنند ایک کری ایٹو جرنلسٹ کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا اور اس کے کولیگ اس کی عزّت کرتے تھے۔ سرجُو سبھی پریس کانفرنسوں میں اس کے ساتھ ہوتی تھی اور بڑے رکھ رکھاؤ اور اخلاق کا اظہار کرتی تھی بلکہ اب یہ سٹیج آچکی تھی کہ لوگ سرجُو شرما کے بغیر ویژن کے وجود ہی کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

تین سال مکمّل کر لیے تھے "ویژن" نے اپنی اشاعت کے۔ یہ عرصہ بڑا جدّوجہد کا عرصہ رہا آنند کے لیے اور ساری جدّوجہد میں سرجُو اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ وہ بہت سوشل قسم کی جرنلسٹ نہیں تھی۔ اس لیے بہت کم لوگوں سے ملتی تھی۔ لیکن جو اسائنمینٹ اسے دی جاتی اسے وہ بڑی ایمانداری اور محنت سے سرانجام دیتی۔ یہ بھی ایک کارن تھا "ویژن" کی کامیابی کا۔ اور اب تو اخبار خود کفیل ہو چکا تھا اور سرجُو شرما کو معقول معاوضہ بھی مل جاتا تھا اپنے کام کے لیے، جسے آنند سیلری نہیں آنریری ام کہتا تھا۔ سیلری یا تنخواہ ایک اپمان جنک نام تھا اُس معاوضے کے لیے جو کرنسی کی شکل میں کسی کام کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ تنخواہ عموماً اس کام کے مقابلے میں کم ہوتی ہے جو کوئی کرمچاری کسی آرگنائزیشن کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے رجسٹروں میں تنخواہ نام کا استعمال ہی نہیں کیا تھا کہیں۔

سات فروری کا دن ایک بار پھر آیا تھا۔

آنند کا اور "ویژن" کا مشترکہ برتھ ڈے یا ان کی جوائنٹ برتھ اینی ورسری! اب کی بار پانچ بڑی بڑی موم بتیاں جلائی تھیں سرجُو نے۔

آنند اور "ویژن" کی مشترکہ روشنیاں جو آدھی رات تک جلتی رہیں گی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ پانچ موم بتیوں کا اُجالا ہی بہت تھا۔ سرجُو نے بجلی بجھا دی تھی۔

اس بار جب سرجُو اور آنند دونوں نے مل کر کیک کاٹا تو اس سے پہلے کہ سرجُو کیک کا ٹکڑا آنند کے مُنہ میں ڈالتی۔ آنند نے ہی کیک اس کے مُنہ میں ڈال دیا اور جب وہ کچھ حصّہ اپنے ہموار چمکتے ہوئے دانتوں سے کاٹ چکی تو اس نے کیک کا باقی حصّہ اپنے مُنہ میں ڈال لیا۔

دس از ان فیئر آنند صاحب۔"

"اِن وار ایوری تھنگ از فیئر۔"

"ناٹ ان لو؟"

"نہیں۔ لو میں تو سب کچھ ہوتا ہی ان فیئر ہے۔"

"خدا کے لیے باتیں کم کیا کرو۔ آپ کی باتیں آپ کو بدنام کرتی ہیں۔"

"اور تمھاری خاموشی سے تمھیں نیک نامی ملتی ہے؟"

"نہیں، مجھے بھی نیک نامی نہیں ملتی۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ کے دوست ہی ہمیں بدنام کرتے ہیں۔"

"اب سمجھ آ گئی تمھیں؟"

"آ گئی۔"

"کیا؟"

"سمجھ۔"

"میں نے سوچا ——"

"کہ وجینتی پلّے آ گئی۔"

"ہاں۔ بڑے آدمی ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کس

نے کہی تھی یہ بات بھلا؟"
"چرنجی لال نے۔"
"کون چرنجی لال، ہمارا چپراسی؟"
"ہاں۔" اور اس بات پر دونوں بہت دیر ہنستے رہے۔ اب اس آدمی سے
کوئی کیا ناراض ہو۔
پھر سرجو نے کہا۔
"ڈرنک بناؤں آپ کے لیے؟"
"صرف میرے لیے؟"
"مسز ورما کے لیے بھی بنا دوں؟"
"مسز ورما کہاں سے ٹپک پڑیں؟" وہ تلخی سے بولا۔
"ٹپکنے والی ہیں، بس۔"
اور عجیب سنجوگ تھا کہ اسی کھشن کال بیل کی آواز آئی۔ دروازے کے باہر واقعی
مسز ورما کھڑی تھی۔ اور آنند سرجو سے کہہ رہا تھا۔
"تم آج تھوڑی سے لے لو، میری خاطر۔"
"پہلے دروازہ تو کھولوں۔"
دروازہ کھولنے کے بعد سرجو کا ارادہ بدل گیا۔ نہ ہی اس نے آنند کے لیے
ڈرنک بنائی اور نہ ہی اپنے لیے۔ یہ عورت جانے ایسے لمحوں میں اچانک کیسے آٹپکتی تھی۔
بڑی چڑھ ہو گئی تھی سرجو کو مسز ورما سے اب۔ وہ شاید ڈرائینگ روم میں بیٹھی بند جالی
دار دروازے سے جھانکتی رہتی تھی۔ کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ جب سرجو فلیٹ کی سیڑھیاں
چڑھتی مسز ورما چوروں کی طرح، تھوڑی دیر بعد وارد ہو جاتی۔ آنند گھر میں نہ ہوتا تو
جلدی چلی جاتی ورنہ وہیں پسر جاتی۔ کئی بار تو سرجو کے من میں آیا کہ اسے ٹوک دے لیکن
پھر آنند کی وجہ سے وہ چپ رہ جاتی۔ آنند بھی تو اسے بیکار اتنی لبرٹی دیتا تھا۔ بڑی عمر
کی عورتوں سے فلرٹ کرنے سے مرد کے کون سے جذبے کی تسکین ہوتی ہے، سرجو یہ نہیں

سمجھ پائی تھی اور اب اس نے سوچا تھا کہ وہ فرائیڈ کو پڑھے گی۔ فرائیڈ تو ہر بی ہیویر کو سیکس سے جوڑتا ہے۔

"میں نے سوچا موم بتیاں جل جائیں تو آؤں" مسز ورما نے کہا۔

"لیکن آپ نے وِش تو کیا ہی نہیں" آنند کی بات سُن کر اس نے اپنے لان سے توڑا ہوا گلاب کا پھول، جو اس نے ہاتھ میں پکڑا تھا، آنند کو پیش کیا اور پھر اس کے گال کو چُوم لیا۔

"تھینکس مسز ورما۔ لیکن آج آپ کے ہونٹوں میں وہ پہلی سی گرمی نہیں"

"آج برف بہت پی ہے میں نے"

"کیا بات تھی ایسی آج؟"

"ہونٹ بہت گرم ہو رہے تھے"

سرجو ایکدم تلملا اُٹھی۔ اس عمر میں یہ عورت کیوں اس قسم کی باتیں کرتی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ کہہ اُٹھے ۔ آپ اپنی عمر کا تو دھیان کیا کریں مسز ورما۔ لیکن وہ اپنا سارا غصّہ پی گئی اور کچھ نہیں بولی۔

"کیک ویک کھلاؤ بھائی، انھیں" آنند نے سرجو سے کہا۔

سرجو نے پلیٹ میں کیک کے ٹکڑے رکھ کر مسز ورما کی طرف پلیٹ بڑھائی تو وہ بولی۔

"بڑی بے دلی سے کیک کھلا رہی ہو؟"

"آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں" آنند نے کہا۔

"طبیعت تو آپ کی ٹھیک نہیں۔ انٹ سنٹ کھاتے رہتے ہو" سرجو نے کھینچ کر کہا۔

"کھاتے نہیں، پیتے رہتے ہو، جواب ٹھیک کر و اپنا"

"اچھا بابا، پیتے رہتے ہو۔ اب آپ اور مسز ورما پیئو میں چلتی ہوں"

"کیوں؟"

"ہمارے گھر کچھ مہمان آنے والے ہیں۔"

"اور یہاں کے مہمان؟"

"انھیں آپ سنبھالیے۔" یہ کہ کر سرجو اپنا پرس اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ کال بیل گونجی۔

دروازہ بھی سرجو نے کھولا۔

سامنے وجینتی پتلے کھڑی تھی۔

"تم آئی ہو یا جا رہی ہو؟" وجینتی نے سرجو کے کندھے سے لٹکے ہوئے پرس کو دیکھ کر پوچھا۔

"ایک آ رہا ہے۔ دوسرا جا رہا ہے۔"

آنند دروازے تک آگیا تھا سرجو کو روکنے کے لیے۔ دروازے پر کھڑی وجینتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"وجینتی، تم؟"

"ہاں۔ وائی آر یو سو سرپرائزڈ؟"

"تمھارے آنے کی کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ اندر آؤ۔"

سرجو ایک طرف ہو گئی وجینتی کو راستہ دینے کے لیے۔

"تم سرجو ایک طرف کیوں ہو گئیں؟"

"راستہ تنگ ہو تو ایک طرف ہو جانا چاہیے۔"

وجینتی نے سرجو کے کندھے پر زور سے دھپ جمائی اور کہا۔

"اے ویری سمارٹ گرل۔"

"تو میں چلوں آنند صاحب؟" سرجو نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں

"اب کیسے جا سکتی ہو تم۔ این اور گیسٹ ہیڈ کم۔"

"اور بھی ہے کوئی؟" وجینتی نے پوچھا

"ہاں۔ مسز ورما۔ مائی لینڈ لیڈی۔"

آنند سرجو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دروازے سے واپس لے آیا۔ اس نے کوئی مدافعت نہ کی۔ آنند کے ہاتھ کے بیچ میں جانے کیا جادو تھا۔ وہ جب اس کے بدن پر ہاتھ رکھ دیتا تھا، وہ برف کی ڈلی کی طرح پگھل جاتی تھی، اس کے لمس کی حرارت میں۔ اس نے اپنے ساری کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وجینتی نے آنند کو اس کے برتھ ڈے پر مبارک باد دی۔ خود ہی میز پر رکھے بڑے کیک سے ایک ٹکڑا کاٹا۔ تھوڑا سا حصہ آنند کے منہ میں ڈالا اور باقی اپنے منہ میں۔

"یہ میری بہت ہی مہربان لینڈ لیڈی ہیں، مسز ورما۔" اس نے اپنی لینڈ لیڈی کا تعارف کرایا۔

"عورتیں تو آپ پر ہمیشہ ہی مہربان رہتی ہیں۔" وجینتی نے کہا

"میرا وینس کا ماؤنٹ سٹرانگ ہے۔"

"آپ کا کون سا ماؤنٹ سٹرانگ نہیں!"

"دوستی کا۔"

"اور دشمنی کا؟" مسز ورما نے پوچھا۔

"وہ بہت ہی زیادہ سٹرانگ ہے۔ مجھے دشمن بناتے نہیں پڑتے۔

"آپ سے آپ بن جاتے ہیں۔"

"بہت بولتے ہو تم۔" مسز ورما نے ڈانٹتے ہوئے کہا

"سوری، مائی سوئٹ لینڈ لیڈی۔"

"کچھ پلاؤ ولاؤ گے بھی کہ بس بولتے ہی جاؤ گے۔"

آنند ڈرنک بنانے لگا۔ اپنے لیے، مسز ورما کے لیے، وجینتی کے لیے، لیکن سرجو کے لیے نہیں بنائی ڈرنک اس نے۔

"یو ڈاؤنٹ ٹیک؟" وجینتی نے پوچھا۔

"نو!" سرجو نے جواب دیا۔

"عورت اور شراب ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتی یہ کہتے ہوئے اس نے سب

کے ہاتھوں میں ان کے گلاس تھما دیئے۔ پھر بولا
"ذرا رک جایئے۔"
پھر اس نے ایک خالی گلاس میں فرج سے نیبو نکال کر نچوڑا، اس میں ٹھنڈا پانی ڈالا اور ذرا سا نمک ڈال کر سرجو کی طرف بڑھایا۔
"دِس اِز یور ڈرنک۔"
"تھینکس۔" وہ بولی۔
اور پھر سب نے اپنے گلاس اٹھا لیے اور گلاسوں کو ہاتھوں میں لیے ڈرائینگ روم میں آ گئے۔
مسز ورما نے اپنی ڈرنک جلدی ہی ختم کر ڈالی۔
"اور بناؤں؟"
"نہیں مجھے نیچے تک چھوڑ آؤ۔"
"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مسز ورما کے بازو کو تھاما اور اسے دروازے تک لے آیا۔
سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے آنند سے کہا۔
"اس لڑکی سے بچ کر رہنا۔"
"وجینتی سے؟"
"ہاں یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔"
آنند نے مسز ورما کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسے اس کے دروازے تک چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آ گیا۔
سرجو اور وجینتی پتے صوفوں پر خاموش بیٹھیں اپنے اپنے گلاسوں سے ہلکے ہلکے سپ لے رہی تھیں۔ لگتا تھا انھوں نے آنند کی غیر حاضری میں آپس میں کوئی گفتگو نہ کی تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد آنند اور سرجو فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے،

وجینتی پتنے کو گیٹ تک چھوڑنے کے لیے۔
اور پھر سرجو اور آنند دونوں واپس آ گئے ڈرائینگ روم میں۔
سرجو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔
"کیا ہوا تمھیں، سرجو؟"
" سرجو جواب دیئے بنا آنند سے لپٹ گئی اور پھر اس کی باہوں سے ایکدم الگ ہوتے ہوئے اس نے کہا
"آپ کی کالی زبان ٹھیک ہی کہتی ہے!"
"کیا ٹھیک کہتی ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں۔ مجھے اس دن چھری سے کاٹ دینی چاہیے تھی آپ کی کالی سیاہ زبان، میں نے غلطی کی اس دن" سرجو اور بھی زور سے رونے لگی۔
"تو اب کاٹ دو۔ میں لے آتا ہوں چھری!"
آنند نے سرجو کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا اور اس کی برسات بھری آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔
"اب نہیں کاٹ سکتی آپ کی زبان۔ اب تو اپنی ہی زبان کاٹوں گی"
"کاٹ دو تم میری کالی زبان!"
آنند کی آواز بھر آگئی۔ اُسے لگا اس کی شکست کا لمحہ آگیا تھا۔ وہ ضرور ہار جائے گا اب۔ یہ کالی رات، اس کے کمرے میں جلتی ہوئی موم بتیوں کا اُجالا۔ اس کے گلاس میں باقی بچی شراب، سرجو کی آنکھوں میں چھلکتی گنگا۔ اتنے مخالف عناصر کا مقابلہ نہیں کر سکے گا وہ۔
آج کا یہ لمحہ بڑا اکڑا لمحہ تھا!
"میرے خدا رحم کر!" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔
لمحہ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔
سرجو اس کی باہوں میں اور بھی مضبوطی سے ڈھل رہی تھی،

پگھل رہی تھی وہ اپنی حرارت میں۔
شاید اس کی شکست کا لمحہ بھی آگیا تھا۔
"بھگوان!" وہ آہستہ سے بولی اور پھر جھکی آنند کے پاؤں چھونے کو۔
"اب نہیں کاٹ سکوں گی تمھاری زبان کبھی!"
آنند نے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں سنبھالا ہی تھا کہ کال بیل زور سے گونجی ایک بار پھر گونجی۔ ایک بار پھر!
سرجو کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ وہ گھنٹی کے اس انداز کو پہچانتی تھی۔
گوزبخش ہی اس طرح تابڑ توڑ کال بیل بجاتا تھا اپنے گھر کی!
آنند دروازہ کھولنے کو جانے لگا تو سرجو نے اسے روک لیا۔
"لیٹ می گو!"
اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ گوزبخش سامنے کھڑا تھا۔
"وہ گھر پر نہیں ہے جسے تم لینے آئے ہو"
یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔
"کون تھا؟"
"میرا بھائی!"
آنند نے اور سوال نہیں کیا۔ خاموش کھڑا رہا۔
سرجو نے باتھ روم میں جا کر اپنی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے خوب چھینٹے مارے۔ چہرے کو اچھی طرح صاف کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال ٹھیک کیے۔ ساڑی کو سنوارا اور پھر میز پر پڑے آنند کے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر چپ چاپ سیڑھیاں اتر گئی۔
آنند اُسے نہ روک سکا اور نہ اس سے کچھ کہہ ہی سکا۔
جب تک وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا سرجو موپڈ سٹارٹ کر کے مین روڈ پر پہنچ چکی تھی!!

سادھنا

ریاست جموں کشمیر کو شیخ محمد عبداللہ کے بعد کوئی بھی اتنا قد آور چیف منسٹر نہیں ملا۔ وہ واقعی شیرِ کشمیر تھا۔ سن سینتالیس میں قبائلیوں کے بڑے ہی زبردست حملے کو نہتے کشمیریوں کی مدد سے روکنا اور کشمیر کی وادی کو ان قیامت خیز لمحوں میں بچا لینا، شیخ عبداللہ کا ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے، جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ڈوگرہ فیوڈل ازم کو ختم کر کے ریاست کو جمہوری نظام دلانا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اور اسے صرف شیخ عبداللہ جیسی شخصیت ہی سرانجام دے سکتی تھی۔

پھر کئی برسوں تک ایسا ہوتا رہا کہ وزارتیں بنتی رہیں اور ٹوٹتی رہیں۔ چیف منسٹر حلف لیتے رہے اور کچھ عرصہ حکومت بھی چلاتے رہے، لیکن بہت دیر تک ٹک نہ سکے۔ کچھ کشمیری عوام کی بیداری، کچھ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور کچھ سیاسی گٹھ جوڑ۔ غرضیکہ کسی نہ کسی سبب سے ریاست کا نظام مجموعی طور پر مضبوط بنیادوں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ لیکن ہر ایک چیف منسٹر نے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور پریس اور میڈیا کا تعاون لینا چاہا۔ آج کے دور میں پریس کا رول بڑا اہم ہے اس لیے کوئی بھی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ پریس اُس کا ساتھ نہ دے اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو اچھالتا رہے۔

سری نگر میں ایک بہت بڑی ایڈیٹرز کانفرنس ہو رہی تھی۔ آنند اور سرجو

دونوں کو ہی دعوت نامے ملے تھے۔

آنند کو تو پہاڑوں سے ویسے ہی پیار تھا اور کشمیر کی وادی سے تو اس کا ذاتی لگاؤ بھی تھا، کیونکہ اس کا بچپن وہیں گزرا تھا۔ اسے جب بھی کشمیر جانے کا موقع ملتا اسے لگتا جیسے وہ ایک بار پھر اپنے بچپن کا زمانہ گزار آیا تھا وہاں۔ ایک عجیب ناسٹیلجیا کی سی کیفیت چھائی رہتی تھی اس کے دل و دماغ پر۔ واپس آجانے پر بھی کئی روز تک وہ ذہنی طور پر اُسی وادی میں جیتا رہتا۔ مانو ایک ادیشن تھا اسے کشمیر کی حسین وادی سے۔

بڑا ایکسائیڈ تھا وہ اس وزٹ کے بارے میں۔

اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو وہ "ویژن" میں کشمیر پر ایک ریگولر فیچر کرنا چاہتا تھا اور وہاں جاکر اس کا پورا بلیو پرنٹ تیار کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسری وجہ تھی سرجو۔ وہ پہلی بار کشمیر جارہی تھی — آنند چاہتا تھا کہ وہ سرجو کو پوری وادی میں گھمائے بلکہ فیچر کا کام بھی وہ اسی کو سونپنا چاہتا تھا۔ سرجو کو بھی بڑا اشتیاق تھا کشمیر جانے کا۔ آنند کے ساتھ جانا تو اسے اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ آنند نے تو بلکہ اپنے کچھ دوستوں کو لکھ بھی دیا تھا۔ اور ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ بھی او۔ کے کروا لیے تھے۔ اپنا ٹکٹ اور سرجو کا ٹکٹ۔

لیکن ایک دن پہلے سرجو کا فادر ایکدم بیمار ہوگیا اور سرجو کا جانا آخری وقت پر کینسل ہوگیا۔ آنند نے بھی جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن سرجو کے بار بار کہنے پر وہ راضی ہوگیا تھا۔ اس نے سرجو کو ایر پورٹ تک جانے سے روک دیا تھا اور اکیلا ہی گیا تھا ایر پورٹ پر وہ۔!

سرجو کے ساتھ نہ ہونے کا بڑا رنج تھا آنند کو۔ پورا دن اس کے من کی یہی حالت رہی۔ اُس رات جب اس نے ٹیلی فون پر بات کرکے سرجو کے فادر کے بارے میں پوچھ لیا، تو اس کی تسلّی ہوئی۔ چنڈی گڑھ کی لائن تو دیر میں ملی لیکن سرجو سے بات ہو جانے پر آنند کو بڑی تسکین ہوئی۔

کانفرنس کے دوسرے دن شام کو ریاست جموّں کشمیر کے ایڈیٹرز اور جرنلسٹس کی

طرف سے چائے تھی۔ جموں اور سری نگر کے کچھ بزرگ جرنلسٹس کے علاوہ آنند کی ملاقات کئی نوجوان جرنلسٹس اور پریس رپورٹرز سے بھی ہوئی۔ دونوں نسلوں کے اخبار نویسوں کے نظریات اور اپروچ میں بڑا فرق تھا۔ آنند کو لگا جیسے پورے ہندستان میں آج یہی کیفیت تھی۔ پرانی قدریں اور نئی قدریں آمنے سامنے کھڑی تھیں اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی سنجیدہ کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کے اپنے اپنے لاجک تھے۔ لیکن انصاف کرنے والا جج ایک ہی تھا۔ جسے "وقت" کہتے ہیں۔ "وقت" چھوٹے اور بڑے، پرانے اور نئے، جوان اور بزرگ کسی میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ اپنا فیصلہ دے دیتا ہے۔ کبھی ایک فریق ناراض ہو جاتا ہے کبھی دوسرا فریق۔ اور اس فیصلے کے خلاف کسی کچہری میں اپیل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہی سب سے بڑی کچہری ہے۔

وقت کی کچہری!

وقت کی عدالت!

اسی پارٹی میں آنند کی ملاقات سادھنا دھر سے ہوئی۔ تیکھے نقوش اور تیکھے ذہن والی ایک فری لانسر۔ اس کی ایک آدھ تحریر آنند کی نظر سے گزری بھی تھی۔ بلکہ تازہ اِلسٹریٹڈ ویکلی میں کشمیری شاعرات پر اس کا ایک آرٹیکل بھی تھا۔

"آپ نے میرا آرٹیکل پڑھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اِلسٹریٹڈ ویکلی کی ایک کاپی ہے میرے پاس۔ آپ آرٹیکل پڑھ کر واپس کر دیجیے۔"

"شکریہ، مجھے تو کشمیر کی دو ہی شاعرات کے بارے میں علم ہے۔ لل ایشوری اور حبّہ خاتون۔"

"دو اور بھی ہیں۔ آرنی مل اور رُوپا بھوانی۔" سادھنا دھر نے کہا۔

"ان میں سے زیادہ مشہور تو حبّہ خاتون ہی ہے نا؟"

"جی ہاں۔ وہ ایک بہت اچھی شاعرہ کے علاوہ ایک بہت اچھی گائیکا بھی تھی۔"

"اور خوبصورت بھی۔"

"وہ تو تھی ہی۔ اسی لیے تو یوسف شاہ چک بادشاہ نے اس سے شادی کر لی تھی اور اسے اپنے محل میں لے گیا تھا۔"

"یہ حبّہ کدل کا علاقہ اسی کے نام پر ہے کیا؟"

"حبّہ کدل حبّہ خاتون کے نام پر ہی ہے۔"

"سُنا تھا بمبئی کا کوئی پروڈیوسر حبّہ خاتون پر فلم بنا رہا تھا۔"

"سُنا تو میں نے بھی تھا۔ فلمی دنیا کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ موسٹ انڈیپینڈنٹ پیپل۔"

سادھنا دھر کی بات سن کر آنند زور سے ہنسا۔

"آپ کو بھی کوئی تجربہ ہوا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"آپ کو چاروں شاعرات میں سے کون پسند ہے؟"

"رُوپا بھوانی۔"

"وہ کیوں؟"

"رُوپا بھوانی دھر خاندان سے تھی۔"

"صرف اس لیے؟"

"یہی سمجھ لیجیے۔ اس کی شادی سپرُو خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کا خاوند بہت شکّی مزاج تھا۔"

"اور آپ کا خاوند؟"

"وہ رُوپا بھوانی کے خاوند سے بھی زیادہ شکّی مزاج تھا۔"

"کمال ہے۔"

"وہ اپنے خاوند کو چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس آگئی تھی۔"

"اور آپ؟"

"میں بھی اپنے پیرنٹس کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔" اپنے نام کے ساتھ سپروؔ میں نے ایک دن بھی نہیں لکھا۔ دھرہی لکھتی ہوں۔"

"آپ بھی شاعری کرتی ہیں؟"

"جی ہاں انگلش میں لکھتی ہوں۔"

"کشمیری میں نہیں؟"

"جی نہیں۔ رُوپا بھوانی میں اور مجھ میں آخر کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے۔"

"تو آپ کچھ سنائیں گی نہیں؟"

"آج نہیں۔"

"تو کب؟"

"کانفرنس ختم ہوجائے تو ایک دن میرے ساتھ گزاریئے گا۔ آپ کو اِدھر اُدھر گھماؤں گی بھی اور اپنی نظمیں بھی سناؤں گی۔"

"تھینکس۔ ویکلی آپ کو کل واپس کردوں گا۔"

"آرٹیکل پڑھنے کے بعد ویسے ہی نہیں۔"

"جی ہاں۔" آنند نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر وہ سادھنا دھر سے الگ ہوگیا۔ دہلی کے کچھ دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس رات آنند اپنے دہلی کے دوستوں سے ہی گھرا رہا۔ آدھی رات کے قریب ہوٹل واپس آیا۔ اس رات وہ سرجُو سے بھی ٹیلی فون پر بات نہ کرسکا۔

کانفرنس کے بعد آنند نے ایک پورا دن سادھنا دھر کے ساتھ گزارا۔

سادھنا کے والدین نے زیرو برج کے پاس ہی دریائے جہلم کے کنارے راج باغ میں اپنی بہت بڑی کوٹھی بنا رکھی تھی۔ سادھنا پر میراؤں کی ماری لڑکی کی طرح آنند کو اپنے والدین سے ملانے اپنے گھر نہیں لے گئی تھی۔ وہ صبح آنند کے ہوٹل ہی پہنچ گئی تھی اور ناشتہ بھی اس نے آنند کے ساتھ ہی کیا تھا۔

"یہ شال میں آپ کے لیے لائی ہوں۔" اس نے شال آنند کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوبصورت شال ہے۔ کہاں سے خریدی ہے؟"

"خریدی نہیں ہے۔"

"تو چرائی ہو گی۔"

"چرائی بھی نہیں۔ میرے فادر کی فیکٹری ہے شالوں کی۔"

"اوہو۔ بہت بہت شکریہ۔" آنند نے شال کو کھول کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہے۔" سادھنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تو اچھا ہوں۔"

"یہ تو شاعروں والا انداز ہے، داد حاصل کرنے کا۔ آپ شاعر بھی ہیں کیا؟"

"بس وہی نہیں ہوں۔" وہ ہنسا اور پھر اس نے شال کندھوں سے اتار کر پلنگ پر ڈال دی۔

"تہ کر دوں؟"

"میں کر لوں گا۔ آپ تکلیف نہ کریں۔" ہو سکے تو مجھے کالے رنگ کی ایک لوئی دلوایئے۔"

"آپ کو لوئی چاہیے؟"

"جی ہاں۔ ایک ہے لیکن پرانی ہو گئی ہے۔"

"اس کے لیے تو کسی بکروال سے دوستی کرنی پڑے گی۔"

"تو رہنے دیجیے۔ بکروال سے دوستی مت کیجیے۔ وہ بیچارا گھر گھاٹ سے جاتا رہے گا۔"

دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ آنند جانے کے لیے تیار ہوتا رہا اور سادھنا اخباروں کے صفحے الٹتی رہی۔

سادھنا ادھر آنند کو ڈل کے کناروں پر ہی گھماتی رہی کیونکہ وہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہارون، نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی اور بس۔ دوپہر کا کھانا جیسا تیسا ملا کھا لیا

اور گھومتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ سب جگہیں یوں تو پہلے بھی کئی بار دیکھ رکھی تھیں آنند نے لیکن سادھنا کے ساتھ ہونے سے ساری کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ سادھنا نے بہت سی تصویریں بھی لی تھیں آنند کی۔

"اتنی ڈھیر ساری تصویروں کا کیا کریں گی آپ؟"

"اپنی لوکیلٹی کے بچوں کو ڈرانے کے کام آئیں گی۔"

"اور اگر بچوں کی ماؤں نے دیکھ لیں تو؟"

"ان کے خاوند ڈریں گے۔"

"ڈریں گے تو خیر کیا۔ آپ کی کوٹھی کے گیٹ پر دھرنا دے دیں گے۔"

"مذاق چھوڑیئے اور میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔"

وہ دونوں چشمہ شاہی کے ٹورسٹ ریسٹورینٹ کے باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے

"لیکن پریس کانفرنس میں تو چیف منسٹر سے سب سے زیادہ اور مشکل سوال آپ ہی نے پوچھے تھے۔"

"وہ پروفیشنل تھے۔"

"اور یہ؟"

"پرسنل معاملہ ہے۔"

"تو پرسنل سوال کے جواب آپ نہیں دیتے۔"

"دیتا ہوں بشرطیکہ وہ بہت پرسنل نہ ہوں۔"

"ویسے ہیں آپ ٹیڑھے آدمی۔"

"میری لینڈ لیڈی بھی یہی کہتی ہے۔"

"اور آپ کی وائف؟"

"اس جھنجھٹ سے ابھی تک بچا ہوا ہوں۔"

"وائف کو آپ جھنجھٹ کہتے ہیں۔"

"اس وقت میں سُپرو صاحب کی طرف سے بول رہا ہوں۔"
"کون سُپرو صاحب؟"
"جن کو چھوڑ کر آپ اپنے پیرینٹس کے ساتھ رہتی ہیں۔"
"تو سُپرو کو بھی کوئی طرف دار مل گیا آخر!"
"یہی سمجھ لیجیے۔ آپ اپنا سوال تو پوچھیے۔"
"آپ نے تو مُوڈ ہی خراب کر دیا سارا۔"
"آئی ایم سوری۔"
"کیا آپ مجھے دہلی میں کوئی کام دِلوا سکتے ہیں؟"
"کس طرح کا کام؟ گورنیس کا، ٹیچنگ کا، سیلز کا، ماڈلنگ کا؟"
"نہیں سبزی بیچنے کا۔"
"وہ تو مشکل ہے۔ نئی نئی سبزی منڈی بن جانے سے سبزی بیچنے کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔"
"کپڑے دھونے کا سہی۔"
"ہر تیسری دُکان ڈرائی کلینر کی ہے دہلی میں۔ یہ کام نہیں مل سکے گا۔"
"تو رِکشا چلانے کا کام دلوا دیں۔"
اس کے لیے لائسنس کی ضرورت ہے۔ عورتوں کو رِکشا چلانے کا لائسنس نہیں ملتا۔"
"بھاڑ جھونکنے کا کام تو مل ہی جائے گا۔"
"وہ تو مل سکتا ہے۔ لیکن یہ کام تو آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے دہلی جانے کی کیا ضرورت ہے۔"
"میرا یہاں سے فوراً ہی چلا جانا بہت ضروری ہے۔ سُپرو سے میرا طلاق کا معاملہ چل رہا ہے۔ یہاں رہوں گی تو جلدی فیصلہ نہیں ہو گا۔"
"فری لانسنگ تو آپ دہلی میں کر ہی سکتی ہیں۔ اس کا انتظام تو ہو جائے گا۔

لیکن مسئلہ مکان کا ہوگا۔"

"کسی ہاسٹل میں انتظام کروا دیجیے گا۔"

"آپ کو دہلی کے بارے میں کتنا معلوم ہے؟"

"بہت کم۔"

"میں پچھلے بیس سالوں سے وہاں جھک مار رہا ہوں اور میں ابھی تک نہیں پہچان سکا اس شہر کو۔ بڑا بہروپیا ہے وہ شہر۔ اُسے آسانی سے نہیں پہچانا جا سکتا۔"

"تو آپ مجھے "ویژن" جوائن کروا دیں۔"

"ویژن تو حاضر ہے لیکن وہ بہت چھوٹا اخبار ہے۔ اور اس کی سرکولیشن بھی بہت زیادہ نہیں۔"

"مجھے سری نگر چھوڑنا ہے ہر حالت میں۔ آئی وانٹ سم بریدنگ سپیس آنند صاحب۔"

"تو سرجُو کے ساتھ آپ بھی شامل ہو جائیے۔"

"سرجُو کون ہے؟"

"سرجُو شرما 'ویژن' کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سوچ لیجیے آپ؟"

"سوچ لوں گی۔"

"لیکن دو بھوکی شیرنیاں ایک پنجرے میں نہیں رہ سکتیں" آنند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شیر نہیں رہ سکتے۔ شیرنیاں تو رہ سکتی ہیں۔"

"بہرحال، مائی آفر سٹینڈز۔"

"تھینک یو ویری مچ، آنند صاحب۔"

جب وہ چشمہ شاہی کے باغ کی سیڑھیوں پر پہنچے تو دونوں رک گئے۔ ڈل لیک اور بلوارڈ روڈ۔ بجلی کے قمقموں کی روشنیوں میں بڑا ہی طلسماتی منظر پیش کر رہے تھے۔ دور پھیلا سری نگر کا شہر ایک مہان جادو نگری کے سمان لگ رہا تھا۔

"کتنا جادو ہوتا ہے روشنی میں"۔ آنند بولا۔
"لمحہ بھر میں اندھیرے کو زندہ کر دیتا ہے"۔
"زندہ بھی اور خوبصورت بھی"۔ آنند نے کہا
"آیئے ایک طرف ہو جائیں۔ میں آپ کو اپنی ایک تازہ نظم سناتی ہوں"۔
پھر وہ دونوں سیڑھیوں سے ہٹ کر گھاس کے قطعے کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ نیم اندھیرے اور نیم اُجالے کی فضا میں سادھنا دھر نے جب اپنی پیاری آواز اور خوبصورت تلفظ کے ساتھ تازہ نظم سنائی تو آنند جھوم اُٹھا۔
"مجھے یہ نظم دے دیجیے 'ویژن' کے تازہ اِشو میں جائے گی"۔
"شکریہ"۔
اور پھر آنند نے بڑی محبت سے سادھنا کا کندھا تھپتھپایا اور سادھنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پیار کو ترستی ہوئی روح کو پیار کی ٹھنڈی شبنم مل گئی تھی۔ رات کو ہوٹل سے آنند نے ٹیلی فون پر سرجو سے بات کی۔
اس کے فادر کی حالت ٹھیک تھی لیکن اس کی لینڈ لیڈی مسز ورما کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور وہ کوما میں تھیں۔ سرجو نے اسے اگلے دن واپس آ جانے کو کہا۔
حالانکہ اگلے دن کے لیے آنند نے کچھ ضروری پروگرام رکھے ہوئے تھے پھر بھی اگلے دن پہلی فلائٹ سے آنند چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔
سادھنا دھر اسے ایرپورٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔
اور اس کے لیے حبۃ خاتون کا ایک بہت اچھا پورٹریٹ بھی لائی تھی۔
"اسے اپنے ڈرائینگ روم میں لگائیے"۔
"ڈرائینگ روم ہے کہاں اپنے پاس؟"
"تو وہ بھی لے جائیے نہیں سے"۔
"نہیں، بعد میں بھیج دینا۔ یا اپنے ساتھ لے آنا جب تم چنڈی گڑھ آؤ"۔
"لے آؤں گی"۔ سادھنا دھر مسکرائی اور پھر اسے چیک اپ کے لیے جاتے ہوئے

دیکھتی رہی۔

جب تک ہوائی جہاز نے اڑان نہ بھری وہ ایر پورٹ پر ہی کھڑی رہی۔ آنند جاتے جاتے اپنا پورا امپیکٹ چھوڑ گیا تھا اور ساتھ لے گیا تھا کیسر کی پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو جو پامپور کے کھیتوں میں گھل رہی تھی اس سمے، نرم نرم دھوپ کی گرمائی میں۔

آنند جب چنڈی گڑھ ایر پورٹ سے اپنے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا ورما صاحب کے گھر کا گیٹ چوپٹ کھلا تھا اور گھر کے در و دیوار سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے اپنا سامان اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں کے سامنے رکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور اس میں ایک چٹ ٹھنسی ہوئی تھی۔ اس نے وہ چٹ نکالی۔ سرجو نے لکھ رکھا تھا۔ میں مسز ورما کی ارتھی کے ساتھ شمشان جا رہی ہوں وقت سے پہنچ جاؤ تو وہیں آجانا ــــــ سرجو۔

چٹ پڑھ کر آنند کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اُسے لگا مسز ورما شمشان سے آگئی تھی، سب کی نظریں بچا کر، اور چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی

ــ تمھارا بہت انتظار کیا میں نے۔

لیکن تم تو وہاں سادھنا دھر کے چکر میں تھے۔ تمھیں واپس آنے کی جلدی کیوں ہوتی۔ ہر سفر کے بعد تم کسی نہ کسی لڑکی کو پھانس لاتے ہو۔ بہت ولگر قسم کے آدمی ہو تم!

اچھا تو میں واپس شمشان جاتی ہوں۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

آنند کو لگا کہ ایک برف جیسے سرد ہاتھ نے اس کے گال کو تھپتھپایا تھا اور پھر اُسے یہ بھی لگا کہ ایک سایہ سا سیڑھیاں اتر کر بڑی تیزی سے چوپٹ کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ وہیں بیٹھ گیا آخری سیڑھی پر۔ اپنے فلیٹ کے بند دروازے سے پیٹھ ٹیک کر۔

اس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں اور وہ اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔

کالے رنگ کی فیونرل وین رُکی تھی سڑک پر۔

اُس میں سے کچھ لوگ اُتر رہے تھے جو مسز ورما کی ارتھی کے ساتھ شمشان گئے تھے۔ سب سے آخر میں سرجو اُتری تھی ورما صاحب کو سنبھالتے ہوئے۔ ورما صاحب تو لڑکھڑا رہے تھے۔ اُن سے تو اپنی چھڑی بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔ پیشتر اس کے کہ سرجو انھیں سہارا دے کر گیٹ تک لاتی آنند سیڑھیاں اتر کر گیٹ کے باہر سڑک پر پہنچ گیا اور ورما صاحب کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

"یور سویٹ لینڈ لیڈی از گان" ورما صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مائی مس فار چون ورما صاحب۔" آنند نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور پھر ایک خاتون نے لپک کر ورما صاحب کے گھر کا تالا کھولا۔ غالباً یہ پربھا تھی، مسز ورما کی بہن۔ اسی کو تو اس نے دہلی میں ٹیلی فون کر کے آنند کے ٹیلی فون کا ادگھاٹن کیا تھا کچھ عرصہ پہلے۔

پھر لوگ دھیرے دھیرے چلے گئے اور ورما صاحب کے ڈرائنگ روم میں صرف چار جنے رہ گئے۔

ورما صاحب۔

پربھا۔

آنند۔

اور سرجو۔

جب شام کو سرجو نے ورما صاحب کو چائے کی پیالی پیش کی تو انھوں نے پیالی چپ چاپ لے لی اور پھر آنند سے بولے۔

"میں پچھلے تیس برسوں میں پہلی بار اکیلے چائے پی رہا ہوں۔"

"ہم سب ساتھ ہیں جیجا جی۔" پربھا نے کہا۔

"تم نہیں سمجھوگی میری بات اِسے صرف آنند ہی سمجھ سکتا ہے۔"

"جی" آنند بولا۔

"بہت یاد کیا اُس نے تمھیں، کوما میں جانے سے پہلے۔"

"شی واز اے گریٹ لیڈی، ورما صاحب۔"

"اُسے ہر وقت کوئی خدمت گزار چاہیے تھا۔ اب میں کس کی خدمت کروں گا؟"

ورما صاحب کا ہاتھ کانپنے لگا۔ انھوں نے لرزتی ہوئی چائے کی پیالی نیچے دری پر رکھ دی۔ ان کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کی خدمت کریں گے، ورما صاحب۔"

آنند کے یہ الفاظ سننے کے بعد ورما صاحب نے بڑے عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

پھر سرجو بولی۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں تازہ چائے لاتی ہوں۔" اس نے دری پر رکھی ورما صاحب کی پیالی اور اپرنا اور آنند کی پیالیاں بھی باری باری اُٹھالیں اور کچن میں چلی گئی۔

ورما صاحب نے پیٹھ دیوار کے ساتھ لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات کو گھر جانے سے پہلے سرجو نے آنند کو دو اہم خبریں دیں۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ وجینتی پلّے اچانک چنڈی گڑھ چھوڑ کر کریلا چلی گئی تھی اور اس کے کہنے کے مطابق "ملیالا منورما ڈیلی" جوائن کرنے والی تھی۔

"لیکن یہ فیصلہ اچانک اس نے کیسے کر لیا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ کچھ ذاتی کارنوں سے اس نے چنڈی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"وہ کون سے ایسے کارن ہو سکتے ہیں؟"

"میں بھی ہو سکتی ہوں ایک کارن۔"

"وہ تو خیر میں بھی ہو سکتا ہوں۔"
"بہرحال وجینتی پتنے چلی گئی ہے۔ وہ آپ کو ایک طویل خط لکھے گی۔"
"کوئی اور خبر؟"
"خاصی اپ سیٹ کرنے والی خبر ہے۔"
"کیا ہوا؟"
"ہوا تو کچھ نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے۔"
"کچھ بتاؤ تو۔"
"گور بخش آپ کے بہت خلاف ہے۔"
"وہ تو کئی دنوں سے میرے خلاف ہے۔"
"اب تو وہ ایک طرح سے انڈر ورلڈ کا دادا بن گیا ہے۔ سبھی کچھ کر رہا ہے آج کل۔"
"وہ سب جو اُسے نہیں کرنا چاہیے؟"
"ہاں۔"
"لیکن زندگی تو اس نے اپنے انداز سے گزارنی ہے، سرجو۔"
"کون منع کرتا ہے اُسے۔ جو چاہے کرے لیکن ہمیں تو پریشان نہ کرے۔"
"کیا ہوا ہے اب؟"
"پچھلے تین چار دنوں میں وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ اگر میں نے آپ کو نہ چھوڑا تو وہ آپ کو مروا ڈالے گا۔"
"اور؟"
"اور یہ کہ میں "ویژن" چھوڑ دوں۔"
"تم نے کیا سوچا ہے؟"
"پتاجی کی صحت اچھی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اور گور بخش ہر روز کوئی نہ کوئی بکھیڑا شروع کر دیتا ہے۔"
"تو کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ ہی بتایئے۔"

"مجھے زندگی کا بڑا موہ ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ اگر میری سلامتی اسی میں ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو، تو چھوڑ دو بے شک۔"

"آپ کہہ رہے ہیں، یہ بات؟"

سرجو نے آنند کو اپنی باہوں میں کس لیا اور اپنا چہرہ آنند کی چھاتی پر رکھ کر رونے لگی۔ وہ کئی دنوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کے صبر کی گاگر چھلک گئی۔ سرجو واقعی ایک ندی بن گئی تھی اس سمے۔

"اور کیا کہوں سرجو؟ آخر تم کب تک اپنے بھائی کا مقابلہ کر سکو گی؛ جو لالچی بھی ہے اور بدمعاش بھی۔"

"جب تک آپ میرے ساتھ ہیں مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

"میں تو ساتھ ہوں، لیکن تقدیر بھی تو ساتھ ہونی چاہیے۔ ستارے بھی تو ساتھ ہونے چاہییں۔"

"اور میری تقدیر، میرے ستارے؟"

"دونوں گردش میں ہیں آج کل۔ اور ابھی کچھ دیر رہیں گے بھی۔"

"تو آپ مجھے ٹال رہے ہیں؟"

"ٹال کہاں رہا ہوں؟ میں ہر گھڑی تمھارے ساتھ ہوں۔ اس بات کا یقین رکھو۔"

آنند نے سرجو کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، پھر جیب میں سے رومال نکال کر اسے پونچھا اور کہا۔

"ہیو فیتھ اِن میں ڈیر۔ آئی شیل ناٹ لیٹ یو ڈاون۔"

آنند کا یہ جواب سن کر سرجو سنبھل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اُس مسکراہٹ کا اُجالا اپنے پلّو میں باندھے پل پل گہرے ہوتے ہوئے رات

کے اندھیرے میں سرجُو اپنے گھر چلی گئی۔ اب اُسے اور تیز روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ جتنی روشنی اس کے پاس تھی وہی کافی تھی۔

کچھ دنوں سے آنند نے ایک بہاری چھوکرا نوکر رکھ لیا تھا۔ وہی آننداور ورماصاحب کا کھانا بناتا تھا۔ ورماصاحب چاہتے تھے کہ کچن انھیں کا استعمال کیا جائے تاکہ ان کے گھر میں کچھ تو زندگی کے آثار نظر آئیں۔ کچن چلاتی سرجُو تھی۔ خرچ آنند کرتا تھا۔

پہلے آنند اکثر دوپہر کا کھانا مِس کر دیا تھا لیکن ورماصاحب کی وجہ سے وہ لنچ کے وقت گھر آجاتا تھا اور ڈائینگ رُوم بھی ورماصاحب کا ہی استعمال ہوتا تھا۔ برتن بھی انھیں کے استعمال ہوتے تھے۔ کبھی کبھی سرجُو بھی شامل ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن عام طور سے وہ دوپہر کا کھانا اپنے ہی گھر میں کھاتی تھی اپنے فادر اور مدر کے ساتھ۔ رات کا کھانا بھی آننداور ورماصاحب اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ شروع شروع میں تو آنند ڈرنک اپنے ہی فلیٹ میں لیتا تھا لیکن ایک دن ورماصاحب نے اسے کہا تھا کہ وہ ڈرنک بھی انھیں کے ڈرائینگ روم میں لیا کرے۔

"لیکن آپ کو تو شراب پینا پسند نہیں، ورماصاحب"۔

"میں خود نہیں پیتا، لیکن میرے سامنے دوسرے تو پی سکتے ہیں"۔

"اسی وجہ سے تو آپ کئی بار مجھ سے ناراض بھی ہوئے تھے"۔

"اس لیے کہ مسز ورما تمھاری وجہ سے زیادہ پینے لگی تھی"۔

"میری وجہ سے؟"

"ہاں۔ پی کر بہک جاتی تھی وہ"۔

"میرا تو ایسا خیال نہیں"۔

"پیتی وہ تمھارے ساتھ تھی، لیکن بہکتی وہ یہاں آکر تھی"۔

"سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں اُس وقت تو وہ ملکہ سمجھنے لگتی تھی اپنے آپ کو"۔

"اور آپ پر حکم چلاتی تھیں؟" آنند ذرا سا ہنسا

"ارے یار پوچھو مت۔ کیا کچھ کرواتی تھی مجھ سے وہ۔"
یہ جواب دیتے ہوئے ورما صاحب بھی ہنسے اور پھر بولے۔
"ایک دن ذراسی مجھے بھی پلانا۔"
"تاکہ آپ بھی بہک سکیں؟"
"اور ایک دن میں بھی حکم چلاؤں؟"
"کس پر؟"
"تم پر ہی چلاؤں گا۔ اب ہے ہی کون میرے پاس۔"
"تو آج ہی یہ نیک کام ہو جائے۔"
"آج نہیں پھر کسی دن سہی۔"

اس دن ورما صاحب کا موڈ خاصا اچھا تھا اور کئی ہفتوں کے بعد انھوں نے زندہ رہنے میں دلچسپی دکھائی تھی۔ ورنہ تو وہ ہر وقت یہی کہتے رہتے تھے کہ مسز ورما کے چلے جانے کے بعد ان کا زندہ رہنا ایک دم بیکار تھا۔

جس دن ورما صاحب نے پہلی بار ڈرنک لی، اس دن سرجو بھی وہیں تھی۔ ڈرنک بنائی بھی اسی نے تھی۔

"ڈرنک بھی تم اسی سے بنواتے ہو؟"
"ہاں۔ عورتیں ناپ تول میں ماہر ہوتی ہیں۔ مجال ہے جو ایک قطرہ بھی زیادہ ڈالیں گلاس میں۔ اچھے ہوٹلوں میں بارز کو عورتیں ہی تو سنبھالتی ہیں۔"
"ویسے تو سٹیٹس آف وومن کے بڑے حامی ہیں، لیکن جب موقع ملے اُن کی کھچائی سے باز نہیں آتے۔"

یہ کہتے ہوئے سرجو نے دونوں کو ڈرنک آفر کیے۔ پھر آنند نے اپنا گلاس بڑی آہستہ سے ورما صاحب کے گلاس سے ٹکرایا اور بولا۔

"ٹو یور ہیلتھ اینڈ لانگ لائف ورما صاحب۔"
دونوں نے اپنے اپنے گلاسوں سے ایک ایک سِپ لیا۔ سرجو نے ایک گھونٹ

نیبو پانی کا لیا اور پھر کچن میں چلی گئی۔ بہاری چھوکرے کا ہاتھ بٹانے۔
کچھ دیر دونوں ہی خاموشی سے پیتے رہے۔ پھر آنند نے سگریٹ سلگا لی اور صوفے سے بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔
"تمھارا کوئی وکیل واقف ہے؟"
"بہت ہیں۔ کہیے کیا کام ہے؟"
"میں اپنی وصیت لکھوانا چاہتا ہوں۔"
"یہ خیال کیسے آگیا اچانک آپ کو؟"
"اچانک نہیں آیا۔ کئی دلوں سے سوچ رہا ہوں۔"
"کیا وصیّت کرنا چاہتے ہیں آپ؟"
"یہ مکان میں تمھارے نام کرنا چاہتا ہوں۔"
"آپ تو ابھی سے بہک گئے۔"
"ارے نہیں میں سنجیدگی سے یہ بات کہ رہا ہوں۔ پربھا چاہتی ہے کہ میری ساری جائداد اُسے مل جائے۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ وہ مسز ورما کی بہن ہے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے؟"
"وہ کچھ دلوں میں چنڈی گڑھ آنے والی ہے۔ اسی مقصد کے لیے۔"
"لیکن میرے نام کیوں کرنا چاہتے ہیں یہ مکان آپ؟"
"اس لیے کہ ایک دن جب مسز ورما تمھارے کمرے سے پی کر آئی تھی تو اس نے مجھے یہی حکم دیا تھا۔ وہ تمھیں بہت پیار کرتی تھی۔"
"مجھے معلوم ہے ورما صاحب۔"
"ایک طرح سے تم میرے رقیب بھی ہو۔"
"ایسا مت کہیے۔"

"کہتے ہیں کہ پینے کے بعد آدمی سچ بولتا ہے۔ اُس نے بھی پی کر ہی سچ بولا تھا۔میں بھی پی کر ہی سچی بات کہہ رہا ہوں۔"

"آئی ایم سوری ورما صاحب۔"

"سُنو۔ تم کل کسی وکیل کو لے آؤ۔ میں یہ سارا مکان تمہارے نام کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں کیا کروں گا اتنے بڑے مکان کو؟"

"یہ بھی بعد میں بتا دوں گا۔"

"تو پھر اسی طرح کرتے ہیں۔" آنند بولا

"کس طرح؟"

"آپ اپنی وصیت میں یہ مکان میرے نام کر دیجیے۔ میں اپنی وصیت میں اسے آپ کے نام کر دوں گا۔"

آنند کی یہ بات سنتے ہی ورما صاحب نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور پھر زور کا قہقہہ لگا کر بولے۔

"یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ شراب چڑھنے لگی ہے؟"

"جب آدمی ایسی باتیں کرنے لگتا ہے؟"

"کیسی باتیں؟"

"جیسے میں کر رہا ہوں۔" آنند نے جواب دیا

"نہیں جیسے میں کر رہا ہوں۔"

دونوں صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب سرجُو کچن سے واپس ڈرائینگ روم میں آئی تو دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے اپنے اپنے خالی گلاسوں کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سرجُو نے پوچھا

"وٹینگ فار دی اینجل۔"

ورما صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اپنا خالی گلاس سرجُو کے حوالے

کر دیا۔

"ماپ تول کو مت بھولنا۔" آنند نے سرجو کی طرف پیار سے دیکھا اور اپنا خالی گلاس بھی اس کی طرف سرکا دیا۔

ماسٹر جگدیش رائے اسپتال سے تو گھر آ گئے تھے لیکن ان کی صحت بحال نہیں ہو رہی تھی۔ "وبژن" کے کارن سرجو شرما کو پی۔ جی۔ آئی کے بہت سے ڈاکٹر جاننے لگے تھے۔ حال ہی میں پی۔ جی۔ آئی کا سالانہ فنکشن تھا جس کے سلسلے میں سرجو نے ایک بہت ہی معلوماتی آرٹیکل "وبژن" میں چھاپا تھا۔ فنکشن کی رپورٹنگ بھی اسی نے کی تھی۔ سرجو کی وجہ سے ماسٹر جی کو تسلی بخش ڈاکٹری امداد مل رہی تھی لیکن بڑھاپا ایک ایسی بیماری ہے جس میں ڈاکٹری سہولت بھی زیادہ رول ادا نہیں کر سکتی۔ اس لیے ماسٹر جگدیش رائے کسی نہ کسی جسمانی پریشانی میں اُلجھے ہی رہتے تھے۔ ایک دن اچانک دوپہر کو انھیں ایسا لگا کہ ان کی دائیں ہاتھ کی انگلیاں سُن ہونے لگی تھیں۔ شروعات پاؤں کی انگلیوں سے ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کی دائیں ٹانگ اور پھر دایاں بازو دونوں ہی سُن ہونے لگے۔ جب تک ڈاکٹر کو بلایا گیا ان کے جسم کے حصّے پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ سرجو کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ نہ ملی اور نہ ہی آنند ملا۔ گوربخش کا تو کچھ علم ہی نہیں تھا کسی کو کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ ماسٹر جی کے پڑوسیوں نے انھیں فوراً ہی پی۔ جی۔ آئی میں پہنچا دیا۔ جہاں انھیں فوری ڈاکٹری امداد مل گئی۔ جب تک سرجو وہاں پہنچی ماسٹر جی کے ٹیسٹ وغیرہ ہو چکے تھے اور انھیں جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

آنند گھر پہنچا ہی تھا کہ سرجو کا ٹیلی فون آیا۔

"میں پی۔ جی۔ آئی سے بول رہی ہوں۔"

"خیریت تو ہے؟"

"پتا جی پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔"

"کیسے؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ پی۔جی۔آئی میں ایڈمٹ ہو چکے تھے۔"
"جسم کے کون سے حصّے پر حملہ ہوا ہے؟"
"دائیں بازو اور دائیں ٹانگ دونوں پر حملے کا گہرا اثر ہوا ہے۔"
"میں آرہا ہوں۔"
"آپ تو ابھی گھر لوٹے ہیں۔ اب آرام کریں۔"
"ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں ماسٹرجی کو۔"
"تو آجائیے۔"
آنند، ورما صاحب کو ماسٹرجی کے اچانک بیمار ہو جانے کی خبر دے کر پی۔جی۔آئی چلا گیا۔
اُس رات ورما صاحب بہت ڈسٹربڈ رہے۔
آنند بھی بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ ان کٹھن گھڑیوں میں کس طرح سرجُو کے کام آسکتا تھا۔
ماسٹرجی کے سنبھلنے کا پروسیس بڑا دھیما تھا۔ ڈاکٹر مایوس تو نہیں تھے لیکن ان کے جلدی صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بھی وہ سو فیصد پُرامید نہیں تھے۔ اس دوران ایک حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ گوربخش اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پی۔جی۔آئی میں اپنے پتا کے پاس گزارنے لگا۔ ماسٹرجی اس کے رویّے میں اس تبدیلی کے لیے خوش تھے اور اس کی ماں کو بھی اس سے خوشی ہوئی تھی۔ لیکن سرجُو کو جانے کیوں شک تھا کہ اس میں گوربخش کی کوئی گہری چال تھی۔ بلکہ ایک دن اس نے آنند سے بھی کہا۔
"آج کل گوربخش ایک دم بدل گیا ہے۔"
"یہ تو خوشی کی بات ہے۔" آنند نے جواب دیا۔
"مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بیوقوف بنا رہا ہے۔"

"کیسے؟"

"پتا جی کی صحت میں اِمپرومینٹ بڑی دھیمی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ جلدی ٹھیک نہ بھی ہو سکیں۔ وہ اس سچویشن کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

"کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے وہ؟"

"وہ دونوں کو بڑی ہوشیاری سے میرے خلاف بھڑکائے گا اور پتا جی کو وصیت لکھوانے پر مجبور کر دے گا۔"

"ہوسکتا ہے تمھارا اندازہ صحیح ہو۔"

"آپ بھی تو روز جاتے ہیں انھیں دیکھنے۔ پتا جی سے کوئی بات کیجیے گا اِس سمبندھ میں۔"

"میرا بات کرنا تو ٹھیک نہیں لگے گا۔ لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی جائے گا۔"

اُسی شام جب آنند ماسٹر جی کو دیکھ کر پی۔ جی۔ آئی سے واپس آنے کے لیے سکوٹر سٹینڈ سے اپنا سکوٹر لینے گیا تو گوز بخش وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی آنند نے کہا۔

"ہیلو گوز بخش۔"

"ہیلو باسٹرڈ۔" اس کا یہ جواب سن کر آنند سکتے میں آگیا۔

گوز بخش کے ساتھ دو چھوکرے اور بھی تھے۔

آنند جب اپنے سکوٹر کو سٹارٹ کرنے لگا تو گوز بخش نے اس کے قریب آکر کہا۔

"میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ بوٹی بوٹی نچوا دوں گا۔ یہ میری آخری وارننگ ہے۔"

آنند نے کوئی جواب نہ دیا اور سکوٹر سٹارٹ کرنے لگا۔

"اس حرام زادی کا بھی انتظام کر رہا ہوں۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ ایک طرف نکل گیا۔

آنند گھر پہنچا تو وہ بڑا ڈی پرسیڈ تھا۔

ورما صاحب کے پاس بھی وہ زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔

اپنے فلیٹ میں آکر وہ وسکی پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اب کیا کرے۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اس کے ستاروں کے عروج کا زمانہ اب ختم ہو رہا تھا اور اس کی زندگی کا کاس اس اب زوال پذیر تھا۔ جس جنگ کو وہ اب تک اکیلے ہی لڑ تا رہا تھا اب اس میں مخالف فریق کی مدد کے لیے کئی طاقتیں شامل ہونے لگی تھیں۔

اکیلا اور تنہا آنند!

اکیلی اور نہتی سرجو!

اور ادھر مخالف قوتوں کا ایک ہجوم، اپنے ہاتھوں میں پرانے لیکن خطرناک ہتھیار لیے!

آنند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اپنے لیے نہیں، سرجو کے لیے۔ وجینتی پلّے کے لیے، اسادھنا دھر کے لیے۔ ان سب کے لیے جو ایمانداری سے جینا چاہتے تھے اور زندگی سے سوائے انصاف کے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا زندگی سے صرف اتنا مطالبہ تھا کہ وہ انھیں امن اور وقار سے جینے دے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں چاہتے تھے وہ۔ ایسے لوگوں میں ماسٹر جگدیش رائے بھی شامل تھے اور ورما صاحب بھی۔ آنند دیر تک گیلی آنکھوں کے سامنے پھیلے دُھندلکے میں آنے والے لمحوں کے دھندلے خاکوں میں زوال پذیر ستاروں کی روشنیاں بھرتا رہا۔

زندگی میں کبھی کبھی تو کوئی لاجک ہی نہیں رہتا۔

کبھی کبھی تو زندگی ایک دم اتنی غیر متوازن، بے تُکی اور ناہموار ہو جاتی ہے کہ آدمی کا ہر قدم غیر محفوظ اور پُر خطر ہو جاتا ہے۔ وہ قدم کسی راہ پر رکھتا ہے اور پہنچ کسی دوسری ہی راہ پر جاتا ہے۔

نہ راہیں اس کا ساتھ دیتی ہیں نہ منزلیں ہی۔

ایک غیر مختتم سفر رہ جاتا ہے اس کے سامنے۔ جس میں اس کا نہ کوئی ہمراہی رہتا ہے نہ ہم سفر نہ کوئی چراغ اس کے ساتھ ہوتا ہے نہ ستارہ۔ اس کا سارا جہان اس کی ذات میں سمٹ آتا ہے اور اس کی ذات سارے جہان سے الگ ہو جاتی ہے۔ بڑی متضاد کیفیت

ہوجاتی ہے اس کی تمام تر شخصیت کی۔ وہ جس کے اندر سنسار بھر کا گیان اکٹھا کیا ہوتا ہے،
ایک ہی لمحے میں مٹی کے خالی برتن کی طرح ہو جاتا ہے جس میں خالی اور کھوکھلی آواز کے
علاوہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ اس کی آواز جو چاروں طرف گونجا کرتی تھی کبھی، اب صرف اس
کے اپنے آپ تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ وہ آواز جسے سننے کے لیے لاکھوں آدمی بیتاب
رہتے تھے کبھی، اب اسے وہ خود بھی پوری طرح نہیں سن سکتا۔ سنتا ہے تو اسے یقین
نہیں آتا کہ وہ اسی کی ہی آواز ہے۔ اب اسے اپنی آواز پر بھی وشواس نہیں۔ اپنی
ذات پر بھی بھروسا اُٹھ گیا ہے اس کا۔

آنند زندگی بھر اسی ایک لمحے سے ڈرتا رہا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ اب وہ لمحہ آگیا تھا۔

صرف اس کی اپنی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ان سب لوگوں کی زندگیوں میں جو کسی
نہ کسی رشتے سے اس سے وابستہ تھے۔

وہ سب بندھن ٹوٹ جائیں گے اب، وہ سب سمبندھ ٹوٹ جائیں گے جو اس نے
بنائے تھے اور انھیں مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

رات کے گہرے سناٹے میں آنند کو لگ رہا تھا کہ سب دیواریں دھیرے دھیرے
ڈھ رہی تھیں اور وہ ان گرتی ہوئی دیواروں کی ہلکی ہلکی آواز سن رہا تھا۔ اور خشک ریت
اور دھول کے غبار دیکھ رہا تھا اپنی دھندلی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے دھندلکے میں!

یا خدا! میں کہاں پہنچ گیا ہوں اس لمحہ!

آنند نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کہے اور پھر اس نے اپنا سر رائیٹنگ ٹیبل
پر ٹکا دیا جس کے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ وسکی پی رہا تھا۔

سرجو کا یہ معمول تھا کہ صبح ایک بار ضرور وہ آنند کے گھر آتی تھی۔ ایک تو اسے
دن بھر کا شیڈیول معلوم ہو جاتا تھا اور دوسرا یہ کہ کوئی ضروری ٹیلی فون کرنے ہوتے تو
آنند کے ٹیلی فون سے کر لیتی۔

اگلی صبح جب سرجو آئی تو آنند نے گورنخش سے ہوئی گفتگو کے بارے میں اسے

کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اسے اس بات کا اندازہ ضرور ہو گیا کہ سرجُو خود بھی پریشان تھی۔

"بہت پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے؟"

"گوربخش نے کچھ کہا تھا آپ سے، کل؟"

"ہاں۔"

"تو آپ پی۔ جی۔ آئی میں مت آیا کریں۔"

"کیوں؟"

"اس سے حالات اور بگڑ سکتے ہیں؟"

"اور تمھارے یہاں آنے سے؟"

"اس سے اور زیادہ بگڑ سکتے ہیں۔ پتاجی کی بیماری نے بہت سے نئے مسئلے کھڑے کر دیئے ہیں۔"

"کون سے مسئلے؟"

"پھر بتاؤں گی۔ آپ "وِیژن" کے دو ایشو اگر خود سنبھال لیں تو میں دوسرے معاملوں سے نپٹ لوں۔"

"سنبھال لوں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

"تھینکس۔ تو میں اب چلتی ہوں۔ پتاجی کے کچھ اور ٹیسٹ ہونے ہیں۔ شام کو مت آیئے ادھر۔"

آنند کا جواب سنے بغیر ہی سرجُو سیڑھیاں اُتر گئی۔ آنند برآمدے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اگلے دو تین دِنوں میں سرجُو سے ملاقات نہیں ہوئی، آنند کی۔

وقت بے وقت ٹیلی فون پر بات ضرور ہوتی رہی۔ آنند بیچ بیچ میں پی۔ جی۔ آئی ہو آتا رہا۔ لیکن گوربخش سے اس کی پھر ملاقات نہیں ہوئی۔

"وِیژن" کا تازہ ایشو خود آنند نے ہی دیکھا تھا۔ اس میں سادھنا دھر کی بھی نظم چھاپی تھی اُس نے۔

"یہ سادھنا دھر کون ہے؟" سرجو نے ٹیلی فون پر پوچھا تھا۔

"سری نگر کی ایک فری لانسر ہے۔"

"اِس بار ملی تھی آپ سے؟"

"ہاں۔"

"بتایا نہیں آپ نے؟"

"خیال نہیں آیا۔"

"اور تو سب خیال آجاتے ہیں آپ کو۔"

"کبھی نہیں بھی آتے۔" آنند نے ہنستے ہوئے کہا، "بڑی انٹیلی جینٹ ہے وہ۔"

"آپ کی چوائیس غلط تھوڑی ہو سکتی ہے۔"

"کب آرہی ہو؟"

"شیل سی۔"

اب سرجو نے ریسیور رکھ دیا تھا یا ٹیلی فون خود ہی کٹ گیا تھا یہ آنند کو معلوم نہیں ہوا۔ بہرحال بات آگے نہیں بڑھی۔

اس روز ماسٹر جگدیش رائے کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔

آنند صبح سویرے ہی پی۔ جی۔ آئی چلا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا اور ٹیسٹ کرواتا رہا تھا۔ دوپہر کے بعد سرجو اور اس کی ماں نے اسے مجبور کر کے گھر بھیجا تھا۔ لنچ اس نے ورما صاحب کے ساتھ لیا اور پھر ویژن کے آفس چلا گیا۔ وہاں سے وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر رات کے نو بجے گھر پہنچا۔

اس دوران وہ لمحہ آکر گزر بھی گیا تھا۔ سرجو جس کو ٹالنے کے لیے اتنا عرصہ بھرپور جدوجہد کرتی رہی تھی۔

ماسٹر جی کی ٹیسٹ رپورٹیں لے کر وہ سپیشل وارڈ میں آئی تھی جس میں آج ہی آنند انھیں شفٹ کروا کر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ سپیشل وارڈ کا بندوبست کرا سکا تھا۔

کمرے میں ایک اجنبی آدمی بیٹھا تھا۔ گوزبخش اور اس کی ماں مسکرا مسکرا کر اس

سے باتیں کر رہے تھے۔

"رپورٹیں مل گئیں؟" ماں نے پوچھا

"جی۔"

"میٹ کیپٹن دیپک شرما۔" گوربخش نے اسے مخاطب کیا۔ "مائی سسٹر، سرجو۔"

پھر وہ دیپک شرما سے مخاطب ہوا۔

دیپک شرما پل بھر کے لیے کرسی سے اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

سرجُو نے رپورٹیں گوربخش کو پکڑائیں اور بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں ڈاکٹر سے مل کر۔"

اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل کر کاری ڈور میں آ گئی۔ لمبے کاری ڈور کا فاصلہ طے کر کے وہ لفٹ تک گئی۔ لفٹ وہاں نہیں تھی۔ پھر وہ لفٹ کے بنا ہی پی۔جی۔آئی کی کئی منزلہ عمارت سے نیچے اُترنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے گوربخش جس ڈرامے کی ریہرسل کرتا آ رہا تھا، یہ اس کا کلائمکس تھا جسے وہ دیکھ کر آئی تھی۔ وہ خود بھی تو غیر ارادی طور پر اس ڈرامے کی ریہرسل میں حصہ لیتی رہی تھی۔ اور اب جب کہ آخری سین کھیلا جا چکا تھا، اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ سیدھی آنند کے گھر گئی۔ فلیٹ بند تھا۔ ایک چابی تو اس کے پاس ہوتی تھی اس نے تالا کھولا اور اندر آ کر صوفے پر گر گئی۔

"تمھاری کالی زبان کاٹ دینی چاہیے تھی اس دن مجھے۔" وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئی اور پھر زار و قطار رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے "ویژن" کے آفس ٹیلی فون کیا۔ آنند وہاں نہیں تھا۔ پھر اس نے کئی اور جگہ ٹیلی فون کیے کہ آنند کا کچھ پتا چلے۔ لیکن کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کسی کو بتا کر جاتا بھی تو نہیں تھا۔ جب وہ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ سے باہر نکلنے لگی تو ورما صاحب نے ٹوک دیا۔

"بنا سلام و دعا کے ہی جا رہی ہو، سرجُو؟"

"ذرا جلدی میں تھی ورما صاحب۔"

"ہاؤ از یور فادر؟"

"ناٹ اِن اے گڈ شیپ۔"

"ٹیک کیر آف دی اولڈ چیپ۔"

"ڈوبنگ اور بیسٹ ورما صاحب۔"

پھر سرجو نے موپڈ سٹارٹ کیا اور "ویژن" کے دفتر میں گئی۔ کچھ دیر کاغذون کو دیکھتی رہی۔ اس دن کے پیپرز دیکھے۔ چائے کی پیالی پی۔ آنند کے بارے میں پوچھا تو اتنا معلوم ہوا کہ وہ آفس سے پریس گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔

وہ ٹوٹی ہاری گھر پہنچی۔ وہ ابھی گھر کے باہر ہی کھڑی تھی کہ ڈرائینگ روم سے گونجتا ہوا گور بخش کا قہقہہ اس کے کانوں میں پڑا۔ پھر اس قہقہے میں نشے میں لتھڑا ہوا ایک اور قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔ نشے میں بھیگے دو کرخت قہقہے اور خالی گھر!

سرجو اپنے گھر سے لوٹ آئی۔

لگتا تھا اب اپنے گھر کے دروازے بھی دھیرے دھیرے اس پر بند ہونے لگے تھے۔ اب شاید اسے اپنا گھر اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہی پھرنا پڑے گا۔

رات نو بجے کے قریب جب آنند گھر لوٹا تو ورما صاحب اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

"تم شاید ذمہ داری کبھی نہیں سیکھو گے؟!"

"سوری سر۔"

"سوری کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تمھاری مہمان چھے گھنٹوں سے انتظار کر رہی ہے۔"

"کون؟"

اسی لمحہ دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے کھڑی ہو گئی سادھنا دھر۔

"مجھے سادھنا دھر کہتے ہیں، حضور۔"

"ارے تم! اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی؟"

"ٹیلی گرام تو دیا تھا۔"
"مجھے نہیں ملا تمھارا ٹیلی گرام۔"
"تار تو جبھی ملے گا جب آپ گھر میں ہوں گے۔"
"دیٹ از رائیٹ۔" آنند زور سے ہنسا۔ "ہی از مائی گارجین۔" اس نے ورما صاحب کی طرف اشارہ کیا۔
"لگتا ہے آپ ساری عمر گارجین ہی تلاش کرتے رہیں گے" سادھنا نے ہنستے ہوئے کہا۔
"بیٹھو تو سہی اب۔" ورما صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
آنند بھی صوفے پر بیٹھ گیا اور سادھنا بھی۔
"گھر میں سب لوگ ٹھیک ہیں؟"
"آپ جن لوگوں کو جانتے ہیں، وہ سب ٹھیک ہیں؟" سادھنا نے جواب دیا۔
"میں نے سادھنا کے لیے ایک کمرہ ٹھیک کروا دیا ہے۔ وہ اسے استعمال کر سکتی ہے۔" ورما صاحب نے کہا۔
"ہاؤ گریٹ یو آر، ورما صاحب۔"
"بہت مسکا لگاتے ہو تم۔"
"کبھی کبھی تو لگانا ہی پڑتا ہے۔"
"کھانا لگاؤں؟" سادھنا دھر نے پوچھا
"آتے ہی گھر کی مالکن بن گئیں؟"
"نہیں اے سرونٹ اونلی۔"
"میں اوپر فلیٹ سے ہو کر آتا ہوں ایک منٹ میں۔"
"وہاں پینے مت بیٹھ جانا۔"
"نہیں ورما صاحب۔ آپ کے بغیر کیسے پی سکتا ہوں۔"
"اب مجھے بھی بدنام کرو تم۔"

"بدنام تو ہم دونوں ہی ہیں، صرف ڈگری کا فرق ہے۔" آنند نے ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور پھر اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"اے سپائلڈ بٹ اے نوبل پرسن۔" ورما صاحب نے سادھنا دھر کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کومینٹ کیا۔

آنند اپنی ڈاک دیکھنے کے لیے میز کی طرف بڑھا۔

سرجو کی ایک لائن کی چٹ پڑی تھی۔

"آئی ایم ان اے ٹیری بل کرائسیس۔"

اس نے چٹ کو موڑتے ہوئے جیب میں ڈال لیا اور پھر اپنا کمرے میں رُکے بیچ چلا آیا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔

کھانے کی میز پر بھی بیٹھ گیا وہ۔ کھانا بھی شروع کر دیا اس نے۔ لیکن بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا اس نے۔ سادھنا نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس کی کسی بات کا جواب دے لیکن اس کے موڈ میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"کچھ نہیں ورما صاحب۔"

"جس شخص کی تمام زندگی کو اس کے مُوڈز کنٹرول کرتے ہوں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یو مسٹ امپروو یور سیلف۔"

"نہیں کر سکتا ورما صاحب۔ آئی ایم سوری۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری بیوی تم جیسے ونگر آدمی پر مرتی رہی۔"

"میں کیا جواب دوں اس کا؟"

"تم کیا جواب دے سکتے ہو۔ تم نہایت ہی ناقابلِ اعتبار آدمی ہو۔"

"آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔"

"اس لڑکی کو کیوں بلایا ہے تم نے یہاں؟"

"میں خود آئی ہوں ورما صاحب۔ انھوں نے نہیں بلایا۔"

"تو واپس چلی جاؤ۔ یہ شخص بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے موڈ کے مطابق اس کے سامنے ناچتے رہیں۔"

"یہ میں نے کبھی نہیں چاہا ورما صاحب۔"

"آئی ایم گوانگ ٹو چینج مائی مائنڈ۔"

"وصیت کے بارے میں؟"

"ہاں۔"

"آئی شیل آلسو چینج مائی مائنڈ۔"

"تم کبھی نہیں بدلو گے۔ مجھے ہی بدلنا پڑے گا۔" ورما صاحب کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے ہاتھ آنند کے کندھے پر رکھ دیا۔

آنند نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔

ورما صاحب نے بڑے جذباتی لہجہ میں کہا۔

"آئی نیڈ یو ویری بیڈلی آنند۔"

"ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کی ضرورت ہے" آنند نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لاکر انھیں چوم لیا۔

سادھنا دھر نے انسانی رشتوں کی ایک نئی تصویر دیکھی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ آرام کریں اب ورما صاحب" آنند انھیں ان کے بیڈ روم کی طرف لے گیا۔

پھر وہ سادھنا سے بولا۔

"تم بھی تھکی ہوئی ہو۔ آرام کرو۔ صبح بیڈ ٹی کے لیے اوپر آجانا، گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔"

آنند نے جواب دیا اور پھر سادھنا کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے

باہر نکل آیا۔

اپنے فلیٹ میں جانے سے پہلے وہ کچھ لمحوں کے لیے گیٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور خاموشس اور سنسان سڑک کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگا لیا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

سادھنا دھر کمرے کی بجلی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اور اپنے آپ کا تجزیہ کرنے لگی۔ اس نے سری نگر چھوڑنے کا فیصلہ شاید جلدی میں کیا تھا۔ اگر اسے اپنا گھر چھوڑنا ہی تھا تو اسے چنڈی گڑھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ جس شخص کے بھروسے پر وہ یہاں آئی تھی اس کا اصلی روپ تو اس نے چند ہی گھنٹوں میں دیکھ لیا تھا۔ اسے تو اپنے آپ اور اپنی زندگی پر ہی کنٹرول نہیں۔ وہ زندگی کی سچویشنز پر کیا کنٹرول کر سکتا ہو گا۔ اس کا اخبار بھی تو بس اس کے موڈز کے مطابق ہی چلتا ہو گا۔ جس لڑکی کو اس نے اپنے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر رکھا ہوا تھا وہ بھی تو واقف ہو گی اس کے لائف پیٹرن سے۔ سادھنا کو لگا کہ اس کا چنڈی گڑھ آنے کا فیصلہ ٹھیک نہیں تھا۔

وہ آئی آنند کے بھروسے پر تھی اور اس وقت سو رہی تھی اس کے لینڈ لارڈ کے گھر میں، جو خود اس سے خوش نہیں تھا۔ اس اجنبی گھر اور اجنبی کمرے میں وہ اپنے آپ کو بڑا غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں ہی تو ورما صاحب سو رہے تھے جن کے خراٹوں کی آواز سادھنا سُن رہی تھی اور اپنی کھلی آنکھیں کمرے کے اندھیرے پر گاڑے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔ وہ کل ہی یہاں سے دہلی چلی جائے گی۔ اس کے پاس دو تین بہت ہی اچھے اور ذمہ دار لوگوں کے ایڈریس تھے۔ وہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔ کم سے کم چنڈی گڑھ جیسی پوزیشن تو نہیں ہو گی اس کی۔

اور لگ بھگ اسی طرح کی بات سوچ رہا تھا اس وقت آنند بھی اپنے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے اور گلاس سے دھیرے دھیرے وسکی پیتے ہوئے اور سگریٹ کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے۔

جس نازک دور سے اس وقت وہ اور سرجو گزر رہے تھے، اس میں کسی بھی غیر شخص

کا ان کے قریب آنا ان دونوں کے حق میں نہیں تھا۔ سادھنا دھر کا اس وقت اچانک آجانا تو کسی بھی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ اُسے آنند سے پوچھ کر آنا چاہیے تھا۔ یہ کرائسس تو اور بھی نازک صورت اختیار کر جائے گا اب۔

آنند بنا کپڑے بدلے ہی رات کے پچھلے پہر پلنگ پر گر گیا اور صبح اس وقت جاگا جب دن نکل آیا تھا۔

سادھنا بھی دیر تک سوئی رہی۔

ورما صاحب اپنے لیے بیڈ ٹی خود ہی بناتے تھے۔ انھوں نے تو خود چائے پی ہی لی تھی، ساتھ میں ایک پیالی سادھنا کو بھی پلادی تھی۔

جب سادھنا آنند کے فلیٹ میں آئی آنند تیار ہو چکا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ تو بہت جلدی تیار ہو گئے؟"

"صبح میں جلدی ہی تیار ہو جاتا ہوں۔ کہیں جانا ہو تو نکل جاتا ہوں۔ دیر سے جاؤ تو لوگ گھر پر نہیں ملتے۔"

"چائے تو آپ نے تیار رکھی ہے۔"

"ایک پیالی پی بھی چکا ہوں۔"

"ایک پیالی تو میں بھی پی کر آئی ہوں۔"

"ورما صاحب نے پلادی؟"

"جی۔"

پھر آنند نے دو پیالیوں میں چائے بنائی اور ایک پیالی سادھنا دھر کو دی۔

"میں آپ کے لیے سماوار لائی ہوں۔ سماوار کی نمکین چائے پلاؤں گی آپ کو۔"

"کب؟"

"جب آپ کہیں۔"

"تو کل سہی۔"

"کل تو میں دِلّی جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"سوچتی ہوں وہیں کام کروں۔"

"مل گیا ہے کام؟"

"ملا تو نہیں، مل جائے گا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔"

"تو چلی جاؤں؟"

"دِل مانتا ہے تو ضرور جاؤ۔"

"آپ دِل ہی کی بات مانتے ہیں۔"

"زیادہ تو اسی کی بات مانتا ہوں۔"

عین اُسی وقت سرجُو سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ بے حد پریشان لگ رہی تھی۔ آنند صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا جہاں وہ سادھنا کے پاس بیٹھا تھا۔

"آؤ سرجُو سادھنا دھر سے ملو۔"

"آپ ہیں سرجُو شرما۔ آنند صاحب آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

"آنند صاحب تعریف کے علاوہ کچھ کرتے ہی نہیں۔"

"تمھاری چوٹ میں نے بہت رات گئے دیکھی تھی۔ کیسے ہیں ماسٹر جی؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"کیا خاص بات تھی؟"

"جو تھی اب وہ عام بات بن چلی ہے۔"

"بیٹھو تو۔"

"نہیں مجھے پی۔جی۔آئی جانا ہے۔"

"میں بھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔"

"آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔"

سرجُو یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ آنند بھی اُٹھ کر اس کے پیچھے دروازے

تک گیا۔

"آپ اپنی مہمان کو اٹینڈ کیجیے۔"

آنند اس کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ تک آیا۔

"اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"پریشان تھی اب نہیں ہوں۔"

"کچھ کہو تو سرجو۔"

"میرا نام "ویٹرن" سے ہٹا دیجیے۔ میں چنڈی گڑھ سے جا رہی ہوں۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

سرجو چلی گئی۔

وہ گھر سے آئی تھی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ ناشتہ آنند کے ساتھ کرے گی۔ کل دوپہر سے وہ بھوکی تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ کل والا سارا قصہ آنند کو سنائے گی اور اس سے پوچھے گی کہ وہ اس کرائسس کا کس طرح مقابلہ کرے۔ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی وہ۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صبح سویرے اس کی ملاقات سادھنا سے ہوگی۔ ظاہر تھا کہ اس نے رات آنند کے فلیٹ میں ہی گزاری ہوگی۔ وہاں رات گزارنے کا کیا مطلب تھا یہ بھی اسے معلوم تھا۔ آنند زندگی میں کبھی کسی ایک عورت سے بندھ کر نہیں رہے گا۔ آج سرجو کا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ آنند نے اس سے اس وقت وشواس گھات کیا تھا جب وہ بے حد کمزور اور بے سہارا ہو چکی تھی اور کوئی بھی چالاک شخص اس کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

اس کا بھائی گور بخش چالاک بھی تھا اور شیطان بھی۔

اور وہ اس وقت بے حد مجبور تھی۔

اس کے بھائی نے اپنے ماں باپ کی مجبوری کا بھی پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا۔ سادھنا دھر کو بھی شاید حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے دہلی جانے

کا خیال چھوڑ دیا۔

"میں چنڈی گڑھ میں ہی رہوں گی اور آپ کا انتظار سنبھالوں گی۔"

"ایک دم کیوں بدل لیا ارادہ تم نے؟"

"جواب طلبی مت کیجیے گا۔"

"نہیں کرتا۔"

"میرے لیے ورما صاحب والا کمرہ ٹھیک ہے، کہیں اور انتظام نہ کروائیے۔"

"آل رائٹ۔"

"اب آپ پی۔ جی۔ آئی جائیے۔ دوپہر کو ملاقات ہوگی۔"

سادھنا نیچے چلی گئی اور آنند پی۔ جی۔ آئی جانے کے لیے گھر سے نکل گیا، لیکن راستے میں کئی جگہ رُکنا پڑا اُسے۔

جب وہ پی۔ جی۔ آئی پہنچا تو دوپہر ہو گئی تھی۔ وارڈ میں گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ ماسٹر جی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے تھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ شام کو ان کے گھر جائے گا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ ابھی اُدھر ہو آئے۔

اپنا سکوٹر لین کے کنارے کھڑا کر کے جب وہ ماسٹر جگدیش رائے کے گھر کا گیٹ کھولنے لگا تو اسے گوربخش سامنے کھڑا نظر آگیا۔

"ماسٹر جی گھر آگئے؟"

"ہاں۔"

"میں انھیں دیکھنے آیا تھا۔"

"وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔"

"سرجو گھر پر ہے؟"

"نہیں وہ چلی گئی ہے۔"

"کب؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں۔ آئندہ ادھر آنا بھی نہ کبھی۔"

آنند گیٹ سے ہٹ کر سڑک پر آگیا اور سکوٹر سٹارٹ کر کے "ویژن" کے آفس چلا گیا۔

زندگی میں جس لمحے کی آمد سے وہ اب تک ڈرتا رہا تھا۔ وہ اب آگیا تھا اور ایک طاقتور دشمن کی طرح اس کے سامنے کھڑا اُسے للکار رہا تھا۔

مقابلہ کرو یا شکست قبول کر لو۔

مقابلہ تو کرنا ہی ہوگا۔

شکست ماننا اس کے اصولوں کے خلاف تھا!

اگر وہ شکستیں مانتا رہتا اور سمجھوتے کرتا رہتا تو شاید یہ لمحہ بھی ٹلتا ہی رہتا اور شاید کبھی آتا بھی نہ۔

لنچ کے لیے وہ گھر نہیں آیا۔

ورما صاحب نے لنچ لے لیا تھا لیکن سادھنا بھوکی ہی رہی تھی۔ اُسے یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ آنند کی غیر حاضری میں کھانا کھالے۔

تین دن کے بعد "ٹریبیون" اور انڈین ایکسپریس" میں خبر چھپی تھی۔ خبر پڑھی بھی سادھنا نے ہی تھی۔

اسسٹنٹ اڈیٹر آف "ویژن" گیٹس میریڈ۔

"سرجو کی شادی کی بات کہیں چل رہی تھی؟" سادھنا نے پوچھا

"مجھے معلوم نہیں۔"

"اس نے آپ کو بتایا بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"کوئی کارڈ وارڈ بھی نہیں بھیجا؟"

"نہیں۔"

"ویری سٹرینج۔"

"وٹ از سٹرینج اِن اِٹ؟" آنند نے غصّے سے کہا۔

سادھنا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ آنند اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہ چاہتا تھا۔ ورما صاحب نے بھی آنند کو زیادہ نہیں کریدا۔ انھیں معلوم تھا کہ اس خبر کا ردِّ عمل آنند پر کیا ہو گا۔

آنند واقعی ذہنی طور پر لڑکھڑا گیا تھا۔

وہ خود ہی قصور وار تھا اس کے لیے۔ سرجو تو آئی تھی اس کے پاس۔ چپ بھی چھوڑ گئی تھی۔ سادھنا غلط وقت پر آئی تھی۔ اسی کارن سرجو اس سازش کا شکار ہو گئی تھی، جس سے آنند اسے بچا سکتا تھا۔ اُسے لگا وہ زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکے گا۔

وقت اور حالات کی سازش سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا!

وہ خود بھی نہیں بچ سکے گا اور اسی طرح برباد ہو گا!!

دو دن کے بعد سرجو شرما کا ایک مختصر سا بیان بھی چھپا۔

"میں نے "ویژن" اخبار چھوڑ دیا ہے۔ میرا اس اخبار سے اب کوئی واسطہ نہیں سرجو شرما۔

اس صدمے کے لیے تو آنند پہلے ہی سے تیار تھا۔

بیان پڑھنے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا۔

"میری کیلکولیشنز کے مطابق اسے یہیں پہنچنا تھا۔"

"کہاں؟"

"جہاں وہ اب پہنچی ہے۔"

"میں کہاں پہنچوں گی؟" سادھنا دھر نے سوال کیا۔

"اس کا جواب سپرو ہی دے سکتا ہے۔ میں نہیں۔"

"سپرو کیوں؟"

"اس لیے کہ تمھارا طلاق کا معاملہ اُس سے چل رہا ہے، میرے ساتھ نہیں۔"

"آپ مجھے آزاد دیکھنا نہیں چاہتے؟"

"شاید نہیں"

وہ رات آنند کے لیے قیامت کی رات تھی۔ وہ بہت تڑپا رات بھر۔ بہت رویا بھی۔ اس نے اپنے ہونٹ بھی کاٹے کئی بار۔ ہونٹوں سے نکلے خون کا ذائقہ بھی چکھا کئی دفعہ۔

اسے رہ رہ کر کوالم بیچ کی وہ شام یاد آرہی تھی جب وہ سرجو اور اس کی دو فرینڈز کو ڑری وینڈرم سے کوالم بیچ کی ریت پر لایا تھا اور لہروں کا لطف لینے کے بعد انھیں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھنے کو کہا تھا اور خود الگ کھڑا رہ پڑا تھا سورج کو سمندر کے پانی میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر۔ اس نے سرجو کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"کوالم بیچ کی ریت پر مرتے ہوئے سورج کو دیکھنے والا ہر انسان، اپنے آپ میں ایک ایسا سمندر ہے۔ لیکن وہ چھلکتا جب ہے، جب اسے کوئی گہرا ذاتی صدمہ ہو۔ دوسروں کے صدموں پر یہ سمندر بھرتا نہیں، ایک خاموش چھوٹا سا پانی کا گڑھا بنا، روح کے اندھیروں میں سویا رہتا ہے۔ اس گڑھے کو سمندر بننے کے لیے ایک بڑے اپ ہیول کی ضرورت ہے، مائی فرینڈز!"

رات کے گہرے سناٹے میں، اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہوئے آنند کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی میں وہ اپ ہیول آگیا تھا جس کے کارن روح کے اندھیرے میں سویا پانی کا خاموش گڑھا، بپھرتا ہوا سمندر بن جاتا ہے!!!

دیپک

یہ سرجو کا ہی اصرار تھا کہ وہ ہنی مون پر جانے سے پہلے دیپک شرما کے بیٹے گڈّو سے ضرور ملے۔ دیپک کو اس کی یہ ضد جچی نہیں۔ سرجو جب بار بار اسی بات کو دہرا رہی تھی تو دیپک نے کھیج کر کہا۔

"آخر کیوں ملنا چاہتی ہو تم گڈّو سے؟"

"میں اس کی ماں ہوں اس لیے!"

"وہ تمھیں اپنی ماں مانے گا تبھی نا!"

"مانے گا کیوں نہیں؟"

"ہنی مون سے واپس آکر بھی تو تم اس سے مل سکتی ہو۔"

"تب تک پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا ہو گا۔"

"اور پانی بھی تو گزرے گا پل کے نیچے سے!"

"اس میں بہت مٹی گھل چکی ہو گی تب تک۔"

دیپک نے بحث نہیں کی تھی۔

گڈّو سناور کے ریذیڈینشیل پبلک سکول میں پڑھتا تھا جو بہت دور تھا وہ تو ان ہی دنوں گھر آتا تھا جب لمبی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ اور وہ بھی جب دیپک خود اس کو لانے کے لیے

جاتا۔ جس طرح سکول کے دوسرے بچے بڑے اشتیاق سے چھٹیوں کا انتظار کرتے تھے اور اپنے ماں باپ کے پاس جانے کا پروگرام بناتے تھے اور انھیں خط لکھتے تھے، گُڈّو اس طرح نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ تو خط لکھتا ہی نہیں تھا کبھی۔ اور پھر گھر میں تھا بھی کون جسے وہ خط لکھے۔ اس کی ممی کو مرے تو پانچ برس سے اوپر ہو گئے تھے۔ جبھی تو اس کے ڈیڈی نے اسے گھر سے نکال کر بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ساری چھٹیاں اکیلے ہی بورڈنگ ہاؤس میں گزار دیتا۔ لیکن یہ سکول کے دستور کے خلاف تھا۔ جس روز اس کا ڈیڈی اُسے سکول میں داخل کرانے کے لیے ساتھ لے جا رہا تھا اُس نے اُسے سو طرح سے روکا تھا۔

"ڈیڈی مجھے اس گھر سے نہ نکالو۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔

"تمھیں ایک بہت ہی اچھے سکول میں داخل کرا رہا ہوں۔ گھر سے تھوڑی نکال رہا ہوں۔"

"میں یہاں بھی تو سکول میں ہی داخل ہوں۔"

"اُس سکول کا کیا مقابلہ ہے اس تھرڈ ریٹ سکول سے۔"

"ممی کو تو یہ سکول بہت پسند تھا۔ اُسی نے تو مجھے داخل کروایا تھا یہاں۔ اور پہلے دن سکول کے سارے بچوں میں ٹافیاں بانٹی تھیں۔"

"تمھاری ممی اب مر چکی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے اس گھر سے مت نکالو ڈیڈی۔ یہاں ممی کی بہت سی تصویریں بھی ہیں، جنھیں میں دن بھر دیکھتا رہتا ہوں۔"

"تم یہ سب تصویریں اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"دادی سے پوچھ لیا ہے آپ نے؟"

"پوچھ لیا ہے۔"

"وہ بھی مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہیں۔"

"ہاں۔"

اس کے بعد اس کے ڈیڈی نے اس کا سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا اور ایک پیکٹ میں اس کی ممّی کی تصویریں ڈال دی تھیں۔ دادی اسے اپنے ساتھ چمٹا کر رونے لگی تھی۔ لیکن گڈّو کو جانے ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ نہ اس کی آنکھ میں آنسو تھا نہ اس کی آواز میں تڑپن تھی۔ وہ تو ایک دم سپاٹ ہو گیا تھا۔ ایک بھی شکن نہ رہی تھی، اس کے دل اور دماغ میں۔ ایک بھاری رولر نے اس کے ذہن کو بالکل ہموار کر دیا تھا۔

جب اس کے ڈیڈی نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تو اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولنے کی بجائے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر نہ اس نے دادی کی طرف دیکھا نہ اپنے گھر کی طرف، ایک دم آنکھیں بند کر لیں اُس نے اور سیٹ کی پشت سے پیٹھ لگالی۔

راستے بھر نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا۔ جب بھی اس کے ڈیڈی نے گاڑی روکی اور اُسے کچھ کھانے پینے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

اور جب سکول پہنچ کر اس نے ڈِکی سے اپنا سامان نکالا تو اس وقت بھی اسے کچھ محسوس نہ ہوا اور جب سکول کے پرنسپل نے اس سے کچھ سوال پوچھے تو وہ جب بھی خاموش رہا۔

"یور سن ڈز ناٹ سپیک اے ورڈ کیپٹن شرما۔"

"ہِی از ٹو گریف سٹرکن ایٹ دی ڈیتھ آف ہز مدر۔"

"آئی سی۔"

"وِل ہی ایڈجسٹ؟"

"سرٹینلی۔"

اس کا ڈیڈی شام کو واپس چلا گیا اور وہ ایک دم اکیلا اور سارے سنسار سے کٹا ہوا دس برس کا لڑکا سر سے پاؤں تک ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔

اس رات وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا کیونکہ دوسری سیٹ ابھی کسی لڑکے کو ایلاٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کھانا رات کو بھی نہیں کھایا تھا۔ صرف پانی پیا تھا تین چار بار اور اپنی

ممی کی تصویروں کو خالی بیڈ پر پھیلا کر انھیں دیکھتا رہا تھا آدھی رات تک۔ اور روتا رہا تھا اور
اپنے آپ سے کہتا رہا تھا۔

"ممی اب میں یتیم ہو گیا ہوں۔"

"اب میرے ڈیڈی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"اب میرا ڈیڈی دوسری شادی کر لے گا۔"

وہ میرے لیے دوسری ماں لائے گا، ممی۔"

"اور میں اسے کبھی ماں کہہ کر نہیں بلاؤں گا۔ میں اُسے مار ڈالوں گا۔"

اور پھر وہ سو گیا تھا اور سوتے میں اس نے خواب دیکھا تھا کہ اس کی عمر کے بہت
سے بچّے اس کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ دو بڑی عمر کے آدمی بھی تھے۔
ایک آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا اور دوسرا آدمی اس کے گھر کا لوہے کا گیٹ کھٹکھٹا رہا
تھا۔ اور سب بچّے بڑی درد بھری آواز میں گا رہے تھے۔

ہم ہیں بھکاری بچّے۔

مانگیں تم سے بھیک ۔

جیون دان!

ایسے کئی بار پہلے بھی ہوا تھا۔

کئی بار یتیم بچّوں کی ٹولیاں اپنے یتیم خانوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے واسطے
ان کے گھر کے باہر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ بچّے بڑی ہی درد بھری آواز میں یتیموں کی حالت کے
نقشے کھینچتے تھے اور اس کی ماں اس کے ہاتھ سے چندے کی صندوقچی میں چندہ ڈلواتی تھی۔
صندوقچی پہ تالا لگا ہوتا تھا اور اسے کپڑے میں سی کر اس پر لاکھ لگی ہوتی تھی۔

ایک بار ایسی ہی ٹولی آئی تھی چندہ لینے۔ ان میں سب بڑی عمر کے لڑکے تھے لیکن
ایک چھوٹی عمر کا گورا سا لڑکا بھی تھا۔ دسمبر کا مہینا تھا۔ خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ اس دن
شاید دُھوپ بھی نہیں نکلی تھی۔ یتیموں کی ٹولی کا درد بھرا گانا سُن کر گڈو باہر آگیا تھا سب
سے چھوٹا گورا لڑکا جو صرف ایک قمیص، پاجامہ پہنے ہوئے تھا، اُسے بڑے ہی غور سے

دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں اس کے موٹے رنگ دار سوئیٹر پر جمی تھیں۔ گڈّو کو لگا تھا جیسے اس گورے یتیم اور بنا کسی گرم کپڑے کے بچے کی نظروں نے اس کے گلے کے اندر، سوئیٹر کی تہوں میں سے، برف کے ٹکڑے ڈال دیئے تھے۔ برف کے ان ٹھنڈے ٹھنڈے ٹکڑوں نے، اس کے سارے جسم میں کپکپی دوڑا دی تھی۔ وہ ڈر کر اندر بھاگ گیا تھا اور ممّی سے بولا تھا۔

"ممّی، مجھے یتیموں کی ٹولی کے ایک لڑکے سے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"کون ہے وہ لڑکا؟" ممی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اُسے باہر لے آئی تھی۔

"وہ رہا!" اس نے چھوٹے اور گورے، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے لڑکے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اس بچّے کے پاس تو کوئی بھی گرم کپڑا نہیں۔" اس کی ممّی نے ٹولی کے لیڈر سے کہا تھا۔

"جس بھی گھر میں جاتے ہیں وہ دس بیس پیسے دے کر ٹال دیتے ہیں۔ گرم کپڑا تو کوئی دیتا ہی نہیں۔"

"میں دیتی ہوں ایک سوئیٹر اس لڑکے کے لیے۔"

"اور یتیم لڑکے بھی تو ہیں، ماں جی!"

"مگر یہ لڑکا سب سے چھوٹا ہے۔" اس کی ممّی نے کہا تھا۔

اور پھر وہ اندر چلی گئی تھی اور اس کا ایک سوئیٹر جسے اس نے بہت کم استعمال کیا تھا، لے کر اس چھوٹے یتیم لڑکے کو پہنا دیا تھا۔

اس اُداس اور درد بھری آنکھوں والے بچّے کے چہرے پر جو ہلکی سی چمک آئی تھی سوئیٹر پہن کر، وہ چمک بہت دنوں تک یاد آتی رہی تھی گڈّو کو۔ اور اسی چمک کے ساتھ جڑا ہوا تھا اس کی ممّی کا دلکش چہرہ اور اس کی بڑی پیاری سی مسکراہٹ جو پل بھر میں سب کو اپنا بنا لیتی تھی۔

اور پھر جانے کیسے گڈّو کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ اس کی ممّی نے اپنے

نرم نرم ہاتھوں سے اس کے بال سہلائے تھے، پھر اس کے گالوں کو چھوا تھا، پھر اُس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے اور کہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا، تمھارا ڈیڈی تمھیں گھر سے نکال دے گا۔ لیکن میں تمھارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ تمھاری حفاظت کروں گی۔ مجھے بھول مت جانا گڈّو!"

اور گڈّو جاگ گیا تھا۔ وہ ڈرا بالکل نہیں تھا۔ اس کے ہوش وحواس قائم تھے اور وہ کھلی آنکھوں سے اپنی ممّی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور اس پر جُھک کر اس کے بال سہلا رہی تھی۔

"تم میرے ساتھ رہنا ممّی۔ مجھے چھوڑ مت دینا۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے بھی یتیموں کی کسی ٹولی میں شامل ہو کر گھر گھر بھیک مانگنی پڑے۔"

"میں زندگی بھر تمھارے ساتھ رہوں گی، اب تم سو جاؤ، ابھی بہت رات باقی ہے۔"

اس کی ممّی اس کا ماتھا سہلاتی رہی تھی اور گڈّو بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔

وہ اس وقت جاگا جب بورڈنگ ہاؤس کے وارڈن نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اتنی دیر تک مت سویا کرو اور اندر سے دروازہ مت بند کیا کرو۔"

"لیس سر!"

گڈّو کو محسوس ہوا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی سے نہ سو سکے گا، نہ جاگ سکے گا۔

دس برس کا معصوم بچّہ، اپنی ماں کے بغیر، سوچنے کے انداز سے بالغ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی عمر سے بہت پہلے۔

جب دیپک شرما نے اپنے بیٹے گڈّو کو ریذیڈینشیل سکول سے گھر آنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس نے بڑی مُشکل سے اس کی دادی کی بیماری کا بہانہ کر کے گڈّو کو سکول سے چھٹّی دلوائی تھی ورنہ پرنسپل دسمبر کے شروع میں چھٹّی دینے کے حق میں نہیں تھا۔ آخری ہفتہ میں تو لمبی چھٹّیاں ہو ہی رہی تھیں وہ جبھی جا سکتا تھا۔ لیکن دیپک شرما نے، گڈّو کی دادی کی بیماری کا وہ نقشہ پیش کیا کہ پرنسپل انکار نہ کر سکا۔ اور جب اسے

چھٹی مل گئی، جس میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی، تو گڈّو گھر جانے پر رضامند نہ ہُوا۔

"میں گھر نہیں جانا چاہتا۔"

"مگر کیوں؟" اس کے ڈیڈی نے سوال کیا۔

"اپنے ایگزامز کی تیاری کروں گا۔"

"بس دو دن میں واپس آجانا۔"

"ایسی کون سی ضروری بات ہے؟"

"کچھ ہے۔"

"تو بتایئے۔"

"وہیں بتاؤں گا۔"

بڑی منت سماجت کرکے دیپک شرما نے اپنے بیٹے کو گھر چلنے کے لیے راضی کیا۔ لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ اس نے دوسری شادی کرلی تھی اور وہ اُسے اس کی دوسری ماں سے ملوانا چاہتا تھا۔

اب گڈّو بڑا بھی ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ بھی کرلیا تھا۔ اس لیے اسے اپنے گھر جانے یا اپنی دادی یا اپنے ڈیڈی سے ملنے کی کوئی خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا تھا کہ چھٹیاں ہو گئی تھیں اور سب لڑکے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے لیکن گڈّو نہیں گیا تھا کیونکہ اس کا ڈیڈی اسے لینے کے لیے دو تین دن لیٹ آیا تھا۔ گُڈّو نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ جب دوسرے لڑکوں کے پیرنٹس چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی آجاتے تھے اس کا ڈیڈی کیوں نہیں آیا تھا۔ گڈّو ذہنی طور سے اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ بالغ ہو گیا تھا اور زیادہ خود کفیل بھی۔ عموماً ان بچّوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی ہے جو اپنے ماں باپ سے اور اپنے گھر سے کسی نہ کسی وجہ سے کٹ جاتے ہیں۔

راستے میں وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا کامکس پڑھتا رہا اور جب اس کا ڈیڈی اس سے کوئی سوال پوچھتا تو وہ مختصر سا جواب دے دیتا ورنہ چپ چاپ پڑھتا رہتا۔ اسے ضرورت

ہی نہ محسوس ہوئی تھی اپنے ڈیڈی سے گفتگو کرنے کی۔ جب اس کے ڈیڈی نے گھر کے سامنے کار روکی تو گڈو عام بچوں کی طرح فوراً ہی دروازہ کھول کر گھر کے اندر کی طرف نہیں لپکا۔ وہ کار سے باہر نکل کر اپنا سامان نکالنے لگا تھا اور پھر وہ خود ہی سامان اُٹھا کر ڈیڈی کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر آیا۔

سرجو نے گھر کے سامنے گاڑی رکنے کی آواز سن لی تھی اور وہ لپک کر باہر آگئی تھی۔

گڈو نے اُسے دیکھا تو حیرت میں آگیا۔

"ہیلو گڈو" سرجو نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اس کا اٹیچی کیس لینے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"ہُو آر یو!" گڈو نے حیرت بھری آنکھیں سرجو پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آئی ایم یور ممی بیٹے"

یہ سن کر اس نے اپنی آنکھیں پاس ہی کھڑے اپنے ڈیڈی پر گاڑ دیں۔

"یس گڈو۔ شی اِز یور ممی"

"یہ جھوٹ ہے۔ مائی ممی اِز ڈیڈ" وہ چیخا اور اپنا اٹیچی کیس ایک طرف پھینک دیا۔ سرجو نے آگے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں لینے کی کوشش کی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ جھوٹ بول کر مجھے میرے سکول سے لائے ہیں۔ بٹ وائی؟"

"میں نے بھیجا تھا تمھارے ڈیڈی کو تمھیں لانے کے لیے" سرجو بولی

"تو میری ممی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آپ اس کے مرنے کے بعد کسی اور عورت کو لے آؤ گے"

دیپک شرما غصّے سے بوکھلا گیا۔

"شٹ اپ یو باسٹرڈ"

اس سے پہلے کہ گڈو کچھ کہتا، اس کی بوڑھی دادی اندر سے آگئی اور اس نے گڈو

کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"تم نے بھی نہیں روکا ڈیڈی کو؟" وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ "تم نے بھی بھُلا دیا ممّی کو دادی؟

"میں کیسے بھُلا سکتی ہوں اُسے۔" دادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سرجُو فرش پر پڑا اٹیچی کیس اُٹھانے لگی تو گڈّو چیخا۔

"لیو اٹ۔"

"چھوڑ دو اُلّو کے پٹھّے کو۔" دیپک شرما سٹپٹا رہا تھا۔

اتنا لمبا سفر، دماغ میں کساؤ، شادی کی دوسری رات اور گھر کا یہ ماحول۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا بیٹا جو اتنا دُبّو ہوا کرتا تھا ایک دم باغی ہو جائے گا۔ وہ تیزی سے قدم اُٹھاتا مکان کے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اپنے آپ میں بڑی شاکڈ اور انسلٹڈ محسوس کرتی ہوئی سرجُو بھی آ گئی۔

گڈّو اور اس کی دادی وہیں کھڑے رہ گئے۔ دادی نے گڈّو کو اپنے ساتھ چمٹا رکھا تھا اور وہ روئے جا رہا تھا۔

"میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔"

"تم میرے پاس رہو گے بیٹے۔"

"تم نے کیوں آنے دیا اس عورت کو گھر میں؟"

"تمھاری ماں ہے وہ۔"

"تم بھی یہ بات کہہ رہی ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی، یہ کہتے ہوئے۔"

دادی نے کوئی جواب نہ دیا اور رونے لگی۔

اور پھر اندر سے دیپک کی آواز گونجی۔

کون مر گیا ہے جو رو رہی ہو اس طرح؟"

"میں خود ہی مری ہوں۔" اس نے جواب تو دیا لیکن آواز بہت اونچی نہیں تھی۔

دیپک نے شاید سُنی نہیں تھی۔

"کمرے میں جاکر روؤ دونوں۔"

اس کا دادی نے کوئی جواب نہ دیا اور گڈّو کو گھسیٹتی ہوئی سی اندر لے گئی۔

دیپک شرما، سرجُو کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا اور ٹینشن میں بھی۔ لمبے سفر سے لوٹتے ہی گھر میں چخ چخ ہو گئی تھی۔ پہلے تو اس کی ماں ہی اُسے چائے بنا کر دیتی تھی۔ کھانا بنانے کے لیے ایک پارٹ ٹائم نوکرانی تھی۔ وہ کھانا بھی بنا دیتی تھی؛ برتن بھی صاف کر دیتی تھی اور گھر کی صفائی بھی کرتی تھی۔ آج سرجُو نے اُسے شام کی چھٹی دے دی تھی۔ اس نے سوچا تھا آج وہ خود ہی کھانا بنائے گی اور گڈّو اور دیپک اور وہ سب اکٹھے بیٹھ کر کھائیں گے۔ لیکن گڈّو کے گھر میں قدم رکھتے ہی سارا واتاورن خراب ہو گیا تھا۔ دیپک اپنی جگہ پریشان تھا، سرجُو اپنی جگہ پہ۔ دیپک نے بڑے نرم لہجے میں سرجُو سے کہا۔

"آج رتنی نہیں آئی کیا؟"

"میں نے اُسے منع کر دیا تھا آنے کو۔"

"کیوں؟"

"سوچا تھا میں خود کھانا بناؤں گی اور ہم سب اکٹھے بیٹھ کر کھائیں گے، لیکن —"

"لیکن کچھ نہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ باہر گھومنے چلیں گے اور کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

"اور گڈّو؟"

"وہ دادی کے ساتھ کھا لے گا۔ اس نے بڑا مِس بی ہیو کیا ہے۔ آئی ایم سوری فار ہِم۔"

"اُس کا اِس طرح بی ہیو کرنا اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم ہی اسے صحیح جج نہیں کر پائے۔"

"تو میں کیا کرتا؟"

"آپ کو اسے بتا دینا چاہیے تھا کہ آپ اسے کیوں گھمرا رہے ہیں۔"

"یہ جاننے کے بعد تو وہ بالکل میرے ساتھ نہ آتا۔"
"لیکن آپ کو اس سے سچ بولنا چاہیے تھا۔"
"تو میں جھوٹا ہوں؟" اس نے کھیج کر کہا۔
"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"
"اور کیا کہا ہے؟"
"کچھ نہیں۔ بحث کو چھوڑو اور آرام کر لو کچھ دیر۔ بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔"
"سب بے کار ہے۔ کل کی رات تم نے ویسے کچھ نہیں کرنے دیا۔ آج کی رات ویسے برباد ہوگی۔"

— مرد صرف اپنی ہی بات سوچتا ہے۔ اسے پورا کروانے کے لیے لاکھ حیلے تلاش کرتا ہے۔ نرم اور پیاری پیاری باتیں کرتا ہے، خود جھوٹ بولتا ہے لیکن جھوٹ سننا نہیں چاہتا۔ ملائم اور نرم نرم باتیں کرنے والے لوگ اکثر ناقابل اعتبار ہوتے ہیں، ان پر اعتبار کر کے ہم اپنا آپ خراب کر لیتے ہیں —

سرجو کو لگا اس کے پیچھے کھڑا آنند اپنی مخصوص گہری آواز میں اپنے سدھانتوں کا بکھان کر رہا تھا۔ وہ سٹپٹا گئی۔ اس وقت وہ اس کی بات ہرگز نہیں سننا چاہتی تھی۔
"تم کیوں خاموش نہیں رہ سکتے؟"
"لیکن میں نے کہا کیا ہے؟" دیپک بولا
"میں آپ سے نہیں کہہ رہی۔"
"اور کس سے کہہ رہی ہو؟"
"اُس سے۔" اپنے آپ میں کھوئی سرجو نے جواب دیا۔
"وہ تو ہے ہی حرام زادہ۔"
"کون؟"
"گڈو، اے باسٹرڈ۔"
سرجو، خالی خالی آنکھیں دیپک کے چہرے پر گاڑے، اس کے پاس کھڑی آنند

کی پرچھائیں کو دیکھ رہی تھی
"تم کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ بھگوان کے لیے چھوڑ دو ۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔"
یہ کہہ کر سرجُو رونے لگی ۔
دیپک شرما کو کچھ بھی سمجھ نہ آرہا تھا ۔
"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ہنی مُون سے واپس آکر اس سے مل لینا ۔ لیکن تم نے ضد نہیں چھوڑی اور میری پہلی رات بھی برباد کردی ۔"
— پہلی رات تو پہلا حملہ ہوتا ہے مرد کا ، ایک معصوم اور بے ہتھیار عورت پر ۔ مرد تو پورے ہتھیاروں سے لیس ہوتا ہے حملے کے لیے ۔ وہ ہر وار بھرپُور اور سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور عورت پسپا ہو کر آخر اپنا سب کچھ اسے سونپ دیتی ہے ۔ پہلی رات تو عورت کی پہلی شکست ہوتی ہے ۔ پہلی رات کے اندھیرے میں مرد اپنی فتح کا پرچم گاڑ دیتا ہے ، عورت کے جسم پر ۔ ہاری ہوئی عورت ، صلح نامہ کے ایک ایک لفظ پر اپنی شکست کی مُہر لگا کر مرد کے حوالے کر دیتی ہے ۔ اپنے پاس اس کی نقل تک رکھ سکنے کی بھی مہلت نہیں دیتا اُسے وہ ۔ اس کے ننگے بدن کو نچوڑ کے دیتا ہوا مرد ، اُسے سیکس کی دُھول میں رول دیتا ہے اور پھر منہ پھیر کر گہری مست نیند سو جاتا ہے اور عورت اپنے ننگے بدن کے دُکھتے ہوئے انگوں کو صبح ہوتے تک سہلاتی رہتی ہے —
آنند پھر اس کے پیچھے کھڑا بول رہا تھا آہستہ آہستہ ، اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر بار بار گیلی زبان پھیرتے ہوئے ۔ یہ اس کی عادت تھی جو سرجُو کو کبھی پسند نہ تھی ۔
"باز نہیں آؤ گے تم ؟" وہ بولی
"میں غلط تو نہیں کہہ رہا ۔" دیپک نے جواب دیا ۔ یہ سمجھ کر کہ سرجُو اسی سے مخاطب تھی ۔
"تم نے کبھی غلط نہیں کہا ، کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ میں ہی ہاری ہوں ہر بار ۔"
"کس سے کہہ رہی ہو ؟"
"آپ سے نہیں ۔"

"اور کس سے؟"

"اُس سے۔"

"اُسے بھول جاؤ۔ وہ اس وقت اپنی دادی کے پاس ہے۔"

"نہیں وہ میرے پاس ہے، میرے سینے سے لگا ہے۔"

"اوخوہ۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟"

"سمجھنے کی ہی تو کوشش کر رہی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے سرجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیپک نے اسے اپنی باہوں میں لینے کی کوشش کی تو اس نے جھٹک دیا اس کی باہوں کو۔

"اب میں کیا کروں اُس اُلو کے پٹھے کا؟ آفٹر آل ہی اِز مائی سن۔"

"لیکن آپ نے اُسے پیار نہیں دیا کبھی۔ وہ پیار کے لیے ترس رہا ہے۔"

"تو تم دے دو اُسے پیار۔"

"شاید میں بھی نہیں دے پاؤں گی۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ٹھیک اُسی سمے پھر آنند آکر بیٹھ گیا اس کے پہلو میں اور کہنے لگا۔

—— پیار تو بہت بڑی طاقت ہے سرجو۔ لیکن یہ کھشمتا سب میں نہیں ہوتی بڑے جوکھم کا کام ہوتا ہے پیار کرنا۔ رُوح تک کو پگھلا دیتی ہے یہ آگ۔ ہم جسے پیار کہتے ہیں اور دوسروں کو جس کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ تو صرف ایکٹنگ ہوتی ہے۔ جتنا اچھا کوئی ایکٹر ہوگا اتنا ہی اچھا پیار کر سکے گی۔ اور اتنی ہی اچھی طرح سے وہ اس کا یقین دلا سکے گا دوسرے شخص کو۔ تمھاری ایکٹنگ بُری نہیں۔ کوشش کرو گی۔ تو کامیاب بھی ہو جاؤ گی ——

اور پھر اس نے سُنا آنند کا قہقہہ۔ وہی انداز، وہی ڈھنگ، وہی طریقہ۔

"ہنسو تو ڈھنگ سے، کبھی سلیقے سے نہیں ہنس سکو گے زندگی میں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ ہنسنا بہت کم نصیب ہوا ہے مجھے۔" اس کے دوسرے پہلو میں بیٹھا دیپک بولا اور اس نے سرجو کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے چھڑایا نہیں اپنا ہاتھ اور بولی۔

"میں آپ سے نہیں کہہ رہی۔"

"تو کس سے کہہ رہی ہو؟"

"اُس سے۔" اس نے اپنے دائیں پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں؟" دیپک نے سٹپٹا کر سرجو کے دائیں پہلو کی طرف دیکھا۔ "کوئی بھی تو نہیں کمرے میں، ہم دونوں کے علاوہ۔"

"ہے!"

"وہ تو دادی سے بحث کر رہا ہے۔ سُن نہیں رہی ہو اس کی اونچی آواز؟"

"وہی تو سُن رہی ہوں۔"

"وہ پاگل کر دے گا تمھیں۔"

"وہ تو مجھے پہلے ہی پاگل کر چکا ہے اور کیا کرے گا اب۔"

پھر وہ اُٹھی اور باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھویا۔ سردی کی ایک تیز لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ دسمبر کے شروع میں ہی اچانک سردی پڑنے لگی تھی۔ ہماچل پردیش اور جموں کشمیر کی پہاڑیوں پر شدید برف باری ہوئی تھی، پچھلی رات۔ اور پچھلی رات ہی نے تو اسے زندگی کے ایک نئے موڑ پر لا کر تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ایک دم اکیلا اور بے سہارا۔ اتنی مدت کا مضبوط اور پر یقین سہارا لمحہ بھر میں ہی تو چھن گیا تھا اُس سے۔ وہ باتھ روم سے باہر نکلنے لگی تو اچانک ٹھٹک گئی۔ دیوار میں لگے آئینے کے پیچھے آنند کھڑا تھا۔ وہی سیریس چہرہ، بکھرے ہوئے بال، کھلے ہونٹوں سے نظر آتے ہوئے سامنے کے دانت۔ بٹنوں کے بغیر پہنے ہوئے چکن کے سفید کرتے میں سے جھانکتے ہوئے چھاتی کے بال اور پھر ہونٹوں تک جاتا ہوا ہاتھ اور اس ہاتھ کی لمبی لمبی انگلیاں اور ان میں پکڑا ہوا فلٹرڈ سگریٹ اور پھر ایک دم دھواں بھر گیا سارے باتھ رُوم میں۔

سرجو کو لگا اس کا دم گھٹنے لگا تھا اس دُھوئیں میں۔

"سگریٹ بجھا دو میرا دم گھٹنے لگا ہے۔" وہ چیخی

اسے بہت زور کا چکر آیا۔ وہ ایک دم دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آئینے میں صرف دھواں ہی دھواں تھا اب۔ نہ کوئی چہرہ تھا وہاں نہ اس کی پرچھائیں تھی کہیں۔ اور پھر وہ دیوار کے ساتھ لگے لگے ہی باتھ روم کے فرش پر ڈھ گئی۔

جب سرجو کو ہوش آیا تو کافی رات بیت چکی تھی اور وہ ڈبل بیڈ میں سے ایک بیڈ میں کمبلوں سے ڈھکی لیٹی تھی اور اس کے سامنے کرسی پر دیپک بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر ابھی ابھی اسے دیکھ کر گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کو لگا تھا کہ کوئی سوئی سی چبھی تھی اس کے بازو میں۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا تھا وہاں۔ اس نے کھلی آنکھوں سے ایک بار سارے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کی نظریں دیپک پر جم گئیں۔

"میں کہاں ہوں؟"

"سونے کے کمرے میں

"یہ میرا کمرہ تو نہیں ہے۔"

"نہیں ہم دونوں کا ہے۔"

"میں تو باتھ روم میں تھی۔"

"وہاں تمھیں چکر آگیا تھا اور تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔"

"ہاں۔" اس نے دماغ پر تھوڑا زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"میں تمھیں اٹھا کر یہاں لے آیا اور ڈاکٹر کو بلایا۔"

"کہاں ہے ڈاکٹر؟"

"وہ تمھیں انجکشن دے کر اور کھانے کی دوائی دے کر چلا گیا ہے۔"

"آپ نے روکا نہیں؟"

"روکنے کی کوئی بات نہیں تھی۔"

"بات تو تھی۔"

"کچھ پیو گی ؟"

"ہاں ۔"

"ماں نے چائے بنا کر فلاسک میں ڈال دی ہے۔ پیالی میں ڈال کر دوں ؟"

"نہیں ۔"

سرجو نے آنکھیں بند کر لیں اور کروٹ لے لی۔

پھر اسے نیند آ گئی۔

کچھ دیر کے بعد دیپک کرسی سے اُٹھا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ ساتھ والے کمرے سے گڈّو کی آواز آ رہی تھی۔

"میں اس عورت کو کبھی اس گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔"

"مورکھوں والی باتیں نہیں کرتے بیٹا۔ تمہارا ڈیڈی اسے بیاہ کر لایا ہے۔ وہ خود تھوڑی ہی چلی آئی ہے۔"

"میرا ڈیڈی جھوٹا ہے۔ وہ تو مجھے یہ کہہ کر لایا تھا کہ تم بہت سخت بیمار ہو۔"

"بیمار تو میں رہتی ہی ہوں۔"

"تم تو بھلی چنگی ہو۔"

"بڑی عمر کا کوئی بھروسا نہیں گڈّو۔"

"اس گھر میں یا تو وہ عورت رہے گی یا میں۔"

دیپک اپنے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور بولا۔

"تم دونوں رہ سکتے ہو اس گھر میں گڈّو۔"

"میں ہرگز نہیں رہوں گا یہاں۔"

"دین لیو دِس ہاؤس۔"

"آل رائیٹ۔"

دیپک شرما واپس آ گیا اپنے کمرے میں۔

وہ ذہنی طور پر واقعی ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے الماری میں سے وسکی کی بوتل

نکالی اور بوتل ہی سے مُنہ لگا کر جانے کتنی وسکی پی گیا۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ بیڈ روم میں چلا آیا اور گلاس اور وسکی کی بوتل بھی ساتھ لے آیا۔ پانی وہ باتھ روم کے نل سے لے لے گا۔

سرجُو سوتی رہی۔

دیپک شراب پیتا رہا۔

گڈّو بہت دیر روتا رہا اور پھر سو گیا۔

اور اس کی دادی تمام رات جاگتی رہی اور بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہی کہ وہ اس کے خاندان کی رکھشا کرے۔

اگلی صبح کا سنّاٹا بڑا حوصلہ شکن تھا۔

سرجُو کی جب آنکھ کھُلی تو صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر۔ جب بستر سے اُٹھ کر وہ باتھ روم میں جانے لگی تو اسے لگا سردی کافی تھی۔ اس نے دیکھا دیپک شرما گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے دو کمبلوں میں سے ایک کمبل آدھا فرش پر گر گیا تھا۔ شاید اسی لیے دیپک نے اپنے گھُٹنے سمیٹ رکھے تھے کہ اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ سرجُو کو بہت ترس آیا اُس پر۔ اُس نے سوچا وہ فرش پر گرے کمبل کو اُٹھا کر ٹھیک کر دے اور پھر دونوں کمبل دیپک کو اچھی طرح اوڑھا دے۔ فرش سے کمبل اُٹھانے کی کوشش میں وہ پاس رکھی تپائی سے ٹکرا گئی اور وسکی کی بوتل اور خالی گلاس فرش پر گر پڑے اور وسکی کی تیکھی سمیل کمرے میں پھیل گئی۔ وسکی کی سمیل سے تو وہ واقف تھی لیکن اس طرح کی تیز اور گلے کو چیر دینے والی سمیل سے اس کا پرتیچے نہیں تھا۔ اسے لگا کوئی تیز دھار اس کے گلے کو کاٹ رہی تھی۔ اس نے فرش پر گری بوتل اور گلاس کو نہیں اُٹھایا اور فوراً باتھ روم کی طرف لپکی۔ اسے اُبکائی آ گئی۔ جیسے وہ ساری شراب جو اس کا خاوند رات بھر پیتا رہا تھا اس کی اپنی رگوں میں اُتر تی رہی تھی اور اب وہ تمام تیزاب اس کے جسم سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

"کچھ پیوگی ؟"
"ہاں ۔"
"ماں نے چائے بنا کر فلاسک میں ڈال دی ہے۔ پیالی میں ڈال کر دوں؟"
"نہیں ۔"
سرجو نے آنکھیں بند کر لیں اور کروٹ لے لی۔
پھر اسے نیند آگئی۔
کچھ دیر کے بعد دیپک کرسی سے اُٹھا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ ساتھ والے کمرے سے گڈّو کی آواز آرہی تھی۔
"میں اس عورت کو کبھی اس گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔"
"مورکھوں والی باتیں نہیں کرتے بیٹا۔ تمھارا ڈیڈی اسے بیاہ کر لایا ہے۔ وہ خود تھوڑی ہی چلی آئی ہے ۔"
"میرا ڈیڈی جھوٹا ہے۔ وہ تو مجھے یہ کہہ کر لایا تھا کہ تم بہت سخت بیمار ہو۔"
"بیمار تو میں رہتی ہی ہوں ۔"
"تم تو بھلی چنگی ہو۔"
"بڑی عمر کا کوئی بھروسا نہیں گڈّو۔"
"اس گھر میں یا تو وہ عورت رہے گی یا میں ۔"
دیپک اپنے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور بولا۔
"تم دونوں رہ سکتے ہو اس گھر میں گڈّو۔"
"میں ہرگز نہیں رہوں گا یہاں ۔"
"دین لیو دِس ہاؤس ۔"
"آل رائیٹ ۔"
دیپک شرما واپس آگیا اپنے کمرے میں۔
وہ ذہنی طور پر واقعی ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اُس نے الماری میں سے وسکی کی بوتل

نکالی اور بوتل ہی سے مُنہ لگا کر جانے کتنی وسکی پی گیا۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ بیڈ روم میں چلا آیا اور گلاس اور وسکی کی بوتل بھی ساتھ لے آیا۔ پانی وہ باتھ روم کے نل سے لے لے گا۔

سرجُو سوتی رہی۔

دیپک شراب پیتا رہا۔

گڈّو بہت دیر روتا رہا اور پھر سو گیا۔

اور اس کی دادی تمام رات جاگتی رہی اور بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہی کہ وہ اس کے خاندان کی رکھشا کرے۔

اگلی صبح کا سنّاٹا بڑا حوصلہ شکن تھا۔

سرجُو کی جب آنکھ کھُلی تو صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر۔ جب بستر سے اُٹھ کر وہ باتھ روم میں جانے لگی تو اسے لگا سردی کافی تھی۔ اس نے دیکھا دیپک شرما گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے دو کمبلوں میں سے ایک کمبل آدھا فرش پر گر گیا تھا۔ شاید اسی لیے دیپک نے اپنے گھٹنے سمیٹ رکھے تھے کہ اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ سرجُو کو بہت ترس آیا اس پر۔ اس نے سوچا وہ فرش پر گرے کمبل کو اُٹھا کر ٹھیک کر دے اور پھر دونوں کمبل دیپک کو اچھی طرح اوڑھا دے۔ فرش سے کمبل اُٹھانے کی کوشش میں وہ پاس رکھی تپائی سے ٹکرا گئی اور وسکی کی بوتل اور خالی گلاس فرش پر گر پڑے اور وسکی کی تیکھی سمیل کمرے میں پھیل گئی۔ وسکی کی سمیل سے تو وہ واقف تھی لیکن اس طرح کی تیز اور گلے کو چیر دینے والی سمیل سے اس کا پہلے پالا نہیں پڑا تھا۔ اسے لگا کوئی تیز دھار اس کے گلے کو کاٹ رہی تھی۔ اس نے فرش پر گری بوتل اور گلاس کو نہیں اُٹھایا اور فوراً باتھ روم کی طرف لپکی۔ اسے اُبکائی آ گئی۔ جیسے وہ ساری شراب جو اس کا خاوند رات بھر پیتا رہا تھا اس کی اپنی رگوں میں اُترتی رہی تھی اور اب وہ تمام تیزاب اس کے جسم سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

باتھ رُوم سے باہر آتے ہی، سردی کی ایک لہر اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ سردی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے تکیے کے قریب رکھی اپنی شال اُٹھائی اور جسم کو اچھی طرح ڈھک لیا۔ شراب کی تیز بُو اب سارے کمرے میں گھُل گئی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ نہ سکی۔ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آگئی اور دروازہ بند نہیں کیا کہ کمرے میں پھیلی شراب کی بُو باہر نکل جائے۔

مکان بہت بڑا نہیں تھا۔ اس نے سوچا وہ ایک بار پھر گھوم لے سارے مکان میں۔ سرسری طور پر تو وہ دیکھ ہی چکی تھی پہلے بھی۔

دیپک کی ماں کے کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔

اُس نے بند کھڑکی کے شیشوں سے دیکھا۔ ماں سو رہی تھی اور گڈّو نے اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھا تھا اور اسی کے ساتھ سٹ کر سو رہا تھا۔ اس گہرے سناٹے میں کھڑکی کے پاس کھڑی سرجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُسے اُس بے ماں کے بچّے کی اس بے چارگی پر ترس آگیا۔ سرجو کو لگا جیسے گڈّو اپنی ماں کے مرنے کے بعد یتیم نہیں ہوا تھا۔ یتیم تو وہ سرجو کے آنے سے ہوا تھا آج۔ جب وہ اس کی ماں کی جگہ لینے کے لیے اس کے باپ کے گھر آگئی تھی۔ اسے شاید اپنی ماں کی موت کا صدمہ اتنی شدّت سے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوا تھا، جب سرجو نے آکر اس کی دوسری ماں بننے کی کوشش کی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ گڈّو اسے ماں کے روپ میں کبھی قبول نہیں کر سکے گا۔ اس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کی جو تصویر نقش تھی اس پر کسی اور تصویر کو سُپر امپوز کرنا ایک مردہ عورت کی لاش پر کسی دوسری زندہ عورت کو لٹا دینے کے مترادف تھا۔ مردہ عورت کسی بھی لمحہ جاگ کر اپنے اوپر زندہ عورت کو نیچے گرا کر، اس کے جسم پر سوار ہو جائے گی اور اپنے تیز تیز ناخنوں سے اس کا انگ انگ نوچ ڈالے گی۔

سرجو اس قدر ڈر گئی کہ وہ کھڑکی کے پاس ایک لمحہ بھی نہ رک سکی اور لوٹ آئی بیڈ روم میں، جس میں پھیلی شراب کی تیز بُو سے بچنے کے لیے وہ باہر نکلی تھی۔ بُو کا تیکھاپن کچھ کم ہو گیا تھا لیکن اس کی رُوح میں جو تیز دھار اُتر گئی تھی، وہ اور بھی گہری اترتی جا رہی

تھی اور اُسے چیرتی جا رہی تھی اندر سے۔ اسے لگا جیسے اس کی نس نس کٹتی جا رہی تھی۔
وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ کمبل اس نے اپنے اردگرد اوڑھ لیے جن کی گرمی سے شاید وہ کٹتی ہوئی رگوں کو سینک سکے۔ اس نے دیکھا اس کا خاوند دیپک شرما پہلے کی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دونوں ٹھنڈے ہاتھ شال میں لپیٹ کر چھاتی سے چمٹا لیے۔

اسے لگا آنند پھر چلا آیا تھا دبے پاؤں اس کے کمرے میں، جیسے وہ درد آ گیا تھا، اس سے کچھ ہی کھشن پہلے، اسے کچوکنے۔ وہ بے آواز قدموں سے آیا تھا اور اس کے بستر میں گھس گیا تھا اور اپنے ٹھنڈے جسم کو سرجو کے گرم جسم کے ساتھ چمٹا دیا تھا۔ اور پھر اپنے ٹھنڈے ہونٹ اس کے کانوں کے قریب لے جا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا تھا اس سے

—— کسی بے نام ہتھیار کی تیز دھار، جس سے تم کٹ رہی ہو اندر ہی اندر، بڑی جان لیوا ثابت ہوتی ہے سرجو۔ بھری بھیڑ میں، تنہائی کا تلخ احساس، زہر بن کر اترنے لگتا ہے، روح کی گہرائیوں میں۔ ایک کھشن ایسا بھی آتا ہے کہ بھیڑ سے کٹا ہوا آدمی خود اپنے آپ سے بھی کٹ جاتا ہے ایک دم۔

—— تم میرے اکیلے پن سے بھاگ کر، اپنی آئی سولیشن کو بھیڑ میں سموتے آ گئی ہو۔ بھیڑ کسی کو اپنے اندر جذب نہیں کرتی۔ اُسے اپنے بے رحم، سنگ دل اور بے ترس بھاری بھاری پاؤں سے روند دیتی ہے۔ روح کا بھیجا تک نکال دیتی ہے بھیڑ۔

—— روح کا اکیلا پن، بھیڑ میں نہیں، اکیلے پن میں ہی نروان پراپت کر سکتا ہے۔ میرے اندر تو جنم جنم کی تنہائی اور اکیلا پن اور آئی سولیشن ہے۔ اس اتھاہ ساگر میں تو ساری دنیا کا اکیلا پن ڈوب سکتا ہے سرجو۔ تم نے تو صرف چھور ہی چھوا تھا ساگر کا۔ تمہارا تو صرف پلو ہی بھیگا تھا۔ تمہاری رُوح پر تو ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی پانی کی۔ اور تم ایک بوند پانی ہی سے ڈر گئیں اور بھاگیں ریت کے اسیم چمکتے ہوئے صحرا کی طرف۔ اس میں چمکتی ہوئی دھوپ سے اپنا گیلا پلو سُکھانے کے لیے۔

—— گیلے پلو اس طرح نہیں سوکھا کرتے سرجو۔ گیلے پلو تو ساگر کی لہروں میں

ڈوب کر ہی سو کھتے ہیں ____

"تو تم ڈبونا چاہتے ہو مجھے؟"

"میں اب کیا چاہوں گا۔"

"تم مجھے چین سے مرنے بھی نہیں دوگے؟"

"تم تو یہاں زندگی کی تلاش میں آئی ہو۔"

"زندگی نہیں ہے یہاں۔"

"تمھاری تقدیر میں نہ زندگی ہے۔ نہ چین ہے، نہ موت۔"

"تم نے لکھی ہے میری تقدیر؟"

"میں بھی تو ساتھ تھا لکھتے وقت۔"

"بکواس کرتے ہو۔" وہ چیخی

اُسی سمے ساتھ والے بیڈ پر سوئے دیپک شرما نے بڑی زور دار کروٹ لی اور بولا۔

"تم نیند میں بھی بڑبڑاتی رہتی ہو۔ آرام سے سونے بھی نہیں دیتیں کسی کو۔" اور سرجو کو لگا کہ وہ آدمی جو درد کی طرح دبے پاؤں چلا آیا تھا اس کے کمرے میں اور چپ چاپ لیٹ گیا تھا اس کے بستر میں، اچانک ہی اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ اب نہ اُس کے ٹھنڈے ہاتھ تھے اُس کی چھاتی پر اور نہ ہی اُس کے ٹھنڈے ہونٹ تھے اُس کے گالوں سے لگے ہوئے۔ بس اُس کے بالوں کی ہلکی سی خوشبو باقی رہ گئی تھی اُس کے بستر میں اور اس کے تکیے پر بکھری ہوئی۔ سرجو نے کمبلوں سے اپنا مُنہ، سر ڈھک لیا پوری طرح اور دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اپنے گیلے پلّو کو سُکھانے لگی تھی وہ، ساگر کی لہروں میں۔ اُسے لگا جیسے گیلے پلّو سے بوند بوند ٹپکنے لگا تھا پانی۔

اس کا تکیہ بھیگنے لگا تھا آنسوؤں سے۔

اور ان میں گُھلنے لگی تھی تکیے پر بکھری ہوئی بالوں کی ہلکی ہلکی خوشبو۔ اور سرجو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر سُبک رہی تھی۔

اچانک ہی اس کے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی چھٹ گئی۔ کمرے میں قدرے اونچی آواز میں گفتگو ہو رہی تھی۔

"گڈّو کہیں چلا گیا ہے۔" گڈّو کی دادی کہہ رہی تھی۔

"کہاں جا سکتا ہے؟ یہیں کہیں ہوگا اڑوس پڑوس میں۔" اس کے خاوند کی آواز تھی۔ سرجو نے کمبل کو ذرا سرکا کر دیکھا۔ دیپک شرما اور اس کی ماں کمرے میں کھڑے بات کر رہے تھے۔

"وہ ساری رات میری چھاتی سے لگا رہا اور روتا رہا۔"

"تمھارے لاڈ ہی نے تو اسے اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔"

"بے ماں کے بچّے کو میں بھی دھتکار دوں؟"

"تو میں دھتکار رہا ہوں اُسے؟" اس کے خاوند نے تیکھی آواز میں جواب دیا

"پیار کو ترس رہا ہے تمھارا بیٹا۔"

"اسی لیے تو دوسری شادی کی ہے کہ اب اسے یہیں واپس لے آؤں اور کسی اچھے سکول میں داخل کرا دوں۔ اُسے ماں کا پیار بھی ملے گا اور گھر میں بھی رہے گا۔"

"جو جی میں آئے سو کرو۔ لیکن اس کو ڈھونڈھو تو؟

اب سرجو کا کمبل اوڑھ کر پڑے رہنا ناواجب تھا۔ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ وہ جان بوجھ کر کمبل نہیں ہٹا رہی تھی اور سونے کا بہانہ کر رہی تھی۔ اس نے کمبل سرکائے۔ شال اوڑھی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پرنام ماں جی۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"

"کیا ہوا؟"

"ماں کہہ رہی ہے، گڈّو گھر سے بھاگ گیا۔" دیپک بولا

"بھاگے گا کیوں وہ گھر سے؟"

"وہ ساری رات بھاگ جانے کی ہی بات کرتا رہا تھا بیٹی۔"

"تو پھر اسے تلاش کیجیے۔" اس نے اپنے خاوند سے کہا۔
"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں دیپک سے۔"
"اس کی چھٹی بھی تو ختم ہو گئی ہے۔ اسے تو آج واپس جانا تھا سناور۔"
"تو پھر وہیں چلا گیا ہوگا۔"
"وہ اکیلا کیسے جا سکتا ہے بیٹے؟"
"تو میں کیا کروں اب؟"
"اسے ڈھونڈیے۔" سرجو نے جواب دیا
"میں نے تو شادی کر کے مصیبت مول لے لی۔ تین دن سے پریشان ہو رہا ہوں۔"

"شادی کو بھی تو تین ہی دن ہوئے ہیں نا۔"
"اور نہیں تو کیا۔" وہ بولا
"دوپہر تک دیکھ لو پھر اسے ڈھونڈنا اِدھر اُدھر بیٹا۔"
"کہاں دیکھوں؟"
"اب میں کیا بتاؤں۔ میں کون سی گھومتی رہتی ہوں شہر بھر میں۔"
"ریلوے اسٹیشن جائیے۔ بس اسٹینڈ پر ڈھونڈیے۔ پولیس میں رپورٹ کیجیے۔ کچھ تو کرنا ہی ہوگا آخر۔"
"تم ہی کر لو۔ مجھ سے تو کچھ نہیں ہوگا۔"
"آپ اس کے فادر ہیں۔"
"تم بھی تو اس کی ماں ہو۔"
"یہی وشواس لے کر تو آئی تھی۔ وہ لوٹ گیا ہے۔"
"بہو کو ماں نہیں مانتا گڈو۔ اسی لیے تو وہ گھر سے بھاگا ہے۔" ماں نے کہا
"تو مرنے دو اُسے، جہاں اُس کی مرضی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا اُسے تلاش کرنے۔" دیپک شرما نے بڑے غصے میں کہا۔

ماں بیٹے کی اس گفتگو پر سرجُو نے کوئی کومینٹ نہ کیا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے بڑی ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ اس نے شال کو اچھی طرح لپیٹ لیا اپنے ارد گرد۔

باتھ روم میں لگے آئینے میں دیکھا سرجُو نے اپنے چہرے کو۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ آنند جو اس کے بستر پر لیٹا رہا تھا، اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ اس کے کُرتے میں گھسائے یہاں تک کیسے آگیا تھا اور آئینے کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا یہ تو اُسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ عین اُس کے سامنے، اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنا چہرہ ٹکائے کھڑا تھا۔

"اب تم یہاں پہنچ گئے؟"

"اسنتشت آتمائیں اسی طرح بھٹکتی پھرتی ہیں۔"

"وہ تو مرنے کے بعد ہوتا ہے۔"

"کئی بار زندگی میں بھی ایسا ہو جاتا ہے، سرجُو۔"

"کب؟"

"جب زندگی اور موت میں زیادہ انتر نہیں رہتا۔"

"تمھارے ساتھ یہی ہو رہا ہے آج کل؟"

"ہاں۔ کچھ دنوں میں تمھارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔"

یہی ہے تمھاری بھوشیہ بانی؟"

"ہاں۔"

اُسی سمے باتھ روم کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جلدی آؤ۔" دیپک شرما کی آواز تھی۔

"آرہی ہوں۔ آپ پینی شروع کیجیے۔"

سرجُو کھشن بھر کو آئینے میں نظر آتے دوسرے چہرے کو بھول گئی اور واش بیسن میں ہاتھ دھونے لگی۔ ٹھنڈے پانی سے اس نے چہرہ بھی صاف کیا، پھر تولیے سے

پوچھا اور باتھ روم کا دروازہ کھولنے سے پہلے ایک بار پھر آئینہ دیکھا وہ چہرہ وہیں موجود تھا۔

"تم سے میں نے کئی بار کہا ہے، صبح کی چائے بنا برش کیے مت پیا کرو۔"

"سوری۔"

"رات بھر کا گندہ ... اندر جاتا ہے۔"

"کر لیتی ہوں برش بابا۔ تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو ایک بات کے۔" سرجو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھرکی۔ پچھلے تین دنوں میں شاید وہ پہلی بار مسکرائی تھی اکیلے میں۔ ورنہ اکیلے میں تو وہ صرف روتی ہی رہی تھی۔ اس نے برش پر پیسٹ پھیلایا اور دانت صاف کرنے لگی۔

دروازے پر زور کا کھٹکا ہوا۔

"آتی کیوں نہیں؟" چائے یخ ہو رہی ہے۔

"ہو جانے دو یخ۔" اس نے ٹوتھ پیسٹ کے جھاگ کو واش بیسن میں تھوکتے ہوئے کہا۔

سرجو باتھ روم میں برش کرتی رہی۔

اور آئینے میں کھڑے آنند کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

کمرے میں دیپک شرما اپنی پیالی میں پڑی چائے دھیرے دھیرے پیتا رہا۔

اور سرجو کی چائے ٹھنڈی ہوتی رہی۔

سرجو کو تو اخبار دیکھے بھی تین دن ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد وہ اس گھر میں کیا آئی تھی کہ اُسے اپنا ڈیلی روٹین بھی بھول گیا تھا۔ کسی جانور کو بھی کوئی خرید کرلے جائے یا اُسے چرا کرلے جائے اور اپنے گھر میں قید کرلے۔ دو چار روز تو وہ بھی نہیں بھولتا اپنے گھر کو۔ اجنبی گھر کو اپنانے میں اور اپنا معمول بھولنے میں تو اُسے بھی کچھ روز لگتے ہیں لیکن اس نے تو اپنا روزمرہ کا روٹین اس گھر میں قدم رکھتے ہی بھلا دیا تھا۔

وہ سویرے سویرے جلتی ہوئی سی بیڈ ٹی کی پیالی۔ غلام علی کے کسی کیسٹ کی ہلکی ہلکی آواز، بستر پر پڑے رہ کر کمبل اُتارنے کی مسلسل کوشش اور پھر تین چار ڈیلی اخباروں کو سرسری دیکھنا۔ اور یہاں نہ صبح کی چائے، نہ کچھ اور۔ دیپک کی ماں اپنی مرضی سے چائے بناتی تھی۔ بلکہ اُبلاتی تھی پانی، چائے کی پتی، شکر اور دودھ کو۔ خاصا جوشاندہ پیتی رہی تھی وہ چائے کے نام پر۔ اور بستر میں پڑے رہ کر کمبل اُتارنے کی عادت ہی نہیں تھی کسی کو یہاں صبح سویرے کھنکارنا شروع کر دیتا تھا دیپک شرما اور ساتھ کے کمرے میں اس کی ماں۔ اور پھر باتھ رُوم میں برش کرتے وقت دھاڑنے کی آواز۔ کیسے لوگ تھے یہ سب۔ اور وہ غلام علی کے راگ کی عاشق۔ ایک آدھ اخبار آتا تھا وہ بھی اُردو میں۔ دیپک شرما منگواتا تھا اپنے لیے۔ ماں کو تو اخبار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھی جہاں اسے اِس سے سروکار ہی نہیں تھا کہ اس کے گھر سے باہر کیا ہو رہا تھا۔ اس کا سارا سنسار تو اس کے اپنے گھر تک ہی محدود تھا بس۔

اور ادھر آنند تھا کہ اس کے پل پل پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ بھی تو نہیں چھپا رہتا تھا اس کی نظروں سے۔ بہت جذباتی ہو کر فیصلہ کیا تھا اس نے آنند سے لمحہ بھر میں تعلقات توڑنے کا اور دیپک شرما سے شادی کر لینے کا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کے ماں باپ نے اور اُس کے بھائی نے اُسے گھر سے نکالنے کی بڑی گہری سازش کی تھی اور اُسے کچھ بھی سُوجھ نہ ملی تھی اس کی۔ وہ دوسرے لوگوں کی تو بڑی سخت جاسُوسی کرتی تھی اور سب کے روزنامچے لکھتی رہتی تھی۔ وہ تو یہاں تک کہا کرتی تھی کہ اس کی تیسری آنکھ تھی جس سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی، جو دوسروں کو اور خود اُسے اپنی دو آنکھوں سے نظر نہ آتا تھا۔ وہ تو اس کا شوجی کے تیسرے نیتر سے مقابلہ کیا کرتی تھی۔ اور اب اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کی تیسری آنکھ صرف دوسروں کے عیب نکالنے کے لیے تھی، وہ اس کے اپنے کسی کام نہ آتی تھی۔ اُسے کچھ بھی تو معلوم نہ ہوا تھا کہ اس کے آس پاس، خود اس کے گھر میں کتنی گہری سازش ہو رہی تھی۔ وہ تو صرف یہی دیکھی رہی تھی کہ آنند کے قریب کوئی اور عورت تو نہیں آ رہی۔ اُس کی تیسری آنکھ کا استعمال بس

اتنا ہی تھا۔ وہ سمجھتی رہی تھی کہ اس نے، شاید آنند پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ اس کی جاگیر بن چکا تھا، جس میں کسی دوسرے کو دخل نہ تھا۔ وہ یہ بات ایک دم بھول گئی تھی کہ فیوڈل سسٹم ایک مدت سے ختم ہو گیا تھا۔ اب جو سسٹم رائج ہو رہا تھا اس میں نہ مرد کسی کی جاگیر تھا اور نہ عورت کسی کی سلطنت بن سکتی تھی۔ عورت اور مرد اپنی مرضی سے تو ذہنی اور نفسیاتی اور جذباتی بلکہ سماجی غلامی قبول کر سکتے تھے لیکن یہ قید ٹھونسی نہیں جا سکتی تھی کسی پر۔ بس بڑی ہوشیار اور تیسری آنکھ رکھنے والی سرجو کو یہ بات بھول گئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ آنند اسے بارہا یہ بات کہہ چکا تھا کہ اپنی زندگی میں جو مقام وہ سرجو کو دے چکا تھا اسے کوئی دوسری عورت حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ ایک فنکار بھی تو تھا۔ اس کی زندگی میں عورت اور مرد اس طرح آ سکتے تھے، جس طرح روزمرہ کے واقعات پیش آتے ہیں۔ یہی بات سرجو کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کا سدھانت یہ تھا کہ مرد اپنے ساتھ وابستہ عورت کی اجازت کے بنا کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس سے میل جول بڑھانا یا اس کے سنگ گھومنا تو بہت دور کی بات تھی۔ کسی غیر عورت سے سیکس تو خیر سرجو کے تصور میں تھا ہی نہیں، وہ تو قربت تک برداشت نہ کر سکتی تھی کسی عورت کی، آنند کے ساتھ۔ یہ بات تو خیر آنند کے اپنے تصور میں بھی نہیں تھی۔ وہ بنیادی طور پر گہری وفاداری نبھاتے میں یقین کرنے والا آدمی تھا اور اُسے اخلاقی قدروں پر بڑا وشواس تھا۔ لیکن اس میں گڑبڑ یہی تھی کہ وہ دباؤ کے آگے بالکل نہیں جھکتا تھا۔ چاہے وہ اخلاقی اور سماجی قدروں کا دباؤ ہو، چاہے اقتصادی دباؤ۔ شاید اسی لیے وہ ایک ہی پروفیشن سے زیادہ دیر تک چمٹا نہیں رہ سکا تھا اور نہ ایک ہی جگہ پر بہت عرصہ تک ٹک سکا تھا۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں اس کے بڑے رِجِڈ خیال تھے۔ اگر وہ کسی عورت کو اپنی زندگی میں لے آتا تھا تو اس کی قدر کرتا تھا اور اس کے جذبات کا احترام کرتا تھا۔ لیکن جہاں اس پر کوئی ذہنی دباؤ پڑا وہ وہیں ٹوٹ گیا۔

آنند شاید اب بھی اسی دباؤ کی شدت سے ٹوٹا تھا۔ اور سرجو نے اس کے

ذہن پر دباؤ ڈالنے میں تھرڈ ڈگری میتھڈز استعمال کیے تھے۔ جیسے پولیس والے کرتے ہیں مجرموں پر۔

سرجو نے اسے مجرم سمجھا تھا۔

صرف Circumstantial evidence سامنے رکھے تھے اُس نے۔

اُس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

اُس سے کوئی جواب طلبی بھی نہیں کی تھی۔ صرف اپنا ہی جواز پیش کیا تھا بڑے اونچے اور کرخت الفاظ میں۔

آنند آرگومینٹس اور ایکس پلینیشنز میں یقین نہیں رکھتا تھا، اس لیے زندگی میں اکثر ناکردہ گناہوں کی سزا ملی تھی اُسے۔ جواب یہاں وہ کیسے دے؟ کون یقین کرتا ہے جواب دہیوں پر؟

سرجو کے خیالات بڑے اسنگت تھے۔ ان کی رُوپ ریکھا بڑی اُلجھی ہوئی تھی۔ ڈور کے سرے جگہ جگہ سے کٹے ہوئے تھے اور ہر سرا فضول میں کسی دوسرے سرے سے اُلجھ جاتا تھا۔ اس لیے اس کی سوچ میں کہیں کوئی لاجک نہیں رہا تھا۔ وہ کر کچھ اور رہی ہوتی تھی سوچتی کچھ اور تھی۔

اور اب دیپک شرما کی ماں کی صبح سویرے اِس اناؤنسمینٹ نے کہ گُڈّو گھر سے بھاگ گیا تھا، سرجو کو اور بھی اُلجھا دیا تھا۔ وہ شال لپیٹے بیٹھی تھی اور اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے خیالات گھوم رہے تھے اس وقت۔ پھر ماں باہر چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیپک بھی چلا گیا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد گرم گرم چائے کی پیالی لے کر آیا تھا وہ سرجو کے لیے۔ پہلے والی چائے تو اب پینے کے قابل نہ رہی تھی۔ چائے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"ماں نے کہا بھی تھا جوتشی سے بیاہ کی تاریخ نکلوالو۔ میں نے نہیں مانی اس کی بات۔"

اور پھر اس کے پلنگ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ سرجو نے کمبل ذرا سرکا دیے تھے اُس

کے بیٹھنے کی لیے جگہ بنانے کو اور پھر کہا تھا۔
"تاریخ نکلوا لیتے آپ، کس نے منع کیا تھا؟"
" تمھارے بھائی نے۔"
"کیوں؟"
" اس کا خیال تھا کہ اگر جلدی شادی نہ ہو گئی تو شاید تم اپنا ارادہ بدل لو۔"
" تو آپ سب لوگ مجھے گھر سے نکلوانا چاہتے تھے؟"
" آئی ڈونٹ نو۔"
"بٹ آئی نو۔"
اور سرجو نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھ دی اور اس کا جی چاہا کہ وہ پیالی کو دوبارہ اٹھائے اور چائے کو باتھ روم کے واش بیسن میں پھینک آئے۔
لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اِموشنز نے ہی تو مارا تھا اُسے ہمیشہ۔
"میں نے تمھارے لیے انگلش پیپر کے لیے کہ دیا ہے۔ شاید آگیا ہو میں دیکھتا ہوں۔ اس لڑکے نے سب غارت کر دیا۔ کہاں مارا مارا پھروں گا اس کی تلاش میں۔"
یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور سرجو نے چائے کی پیالی تک اپنے ہونٹ لے جا کر اُسے چھُوا اور پھر ساری چائے باتھ روم میں انڈیل دی۔
اُسی لمحے دیپک شرما اخبار لیے کمرے میں داخل ہوا۔
" بھوپال کی یونین کار بائیڈ کمپنی کی فیکٹری میں زہریلی گیس لیک کر گئی۔ ڈھائی ہزار لوگ مر گئے۔ قیامت آگئی بھوپال میں۔" یہ کہہ کر اس نے انگریزی کا اخبار سرجو کی طرف بڑھا دیا اور خود اُردو کا اخبار لیے باہر چلا گیا۔ شاید ماں کو بھی یہ دردناک خبر سُنانے۔
پریشان اور ذہنی طور پر اُلجھی ہوئی سرجو اپنے سامنے کمبلوں پر اخبار کا پہلا صفحہ پھیلائے اُس پر جھک گئی۔
سرجو جوں جوں اس ٹریجڈی کی تفصیلات پڑھتی گئی وہ اور بھی پریشان ہوتی

گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سمندر چھلک آئے اور وہ اس بُری طرح سے رونے لگی کہ آنسوؤں کا پورا سمندر اخبار کے صفحے پر پھیل گیا۔ اخبار کے حروف چھوٹی چھوٹی لاشوں کی طرح بکھرے ہوئے پانی کی سطح پر ابھرنے لگے۔

بھوپال۔ دسمبر ۳ (سوموار)

آدھی رات کے دو گھنٹے بعد بھوپال کے سوئے ہوئے شہر میں قیامت برپا۔ یونین کاربائیڈ فیکٹری سے زہریلی گیس، میتھل آئی سوسائی نیٹ، لیک ہوگئی۔ یہ زہریلی گیس کاربن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن کا مرکب ہے، جس کے اثرات بڑے مہلک ہوتے ہیں۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی رات میں، پُرانے بھوپال کے علاقوں میں سے ایک لاکھ کے قریب لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں بوڑھے آدمی اپنی لاٹھیوں کی مدد سے، عورتیں پیٹی کوٹوں میں اور اپنے چیختے ہوئے بچوں کو سنبھالے، انسانوں کے ایک سمندر کی طرح اُمڈ پڑے تھے۔ وہ کھانس رہے تھے۔ اپنی دُکھتی ہوئی بہتی آنکھوں کو پونچھے جا رہے تھے اور ان میں سے کچھ خون بھی تھوک رہے تھے۔ اپنی اپنی جانیں بچانے کی اس جان لیوا کوشش میں کئی لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے اور بہت سے زہریلی گیس کے شدید اثر سے مر بھی گئے تھے۔

پو پھٹنے سے بہت پہلے، حمیدیہ ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں سینکڑوں لوگ بہت بُری حالت میں پہنچ چکے تھے۔ جو علاقے اس حادثے سے شدید طور سے متاثر ہوئے تھے ان میں چھولا، جے پرکاش نگر، ٹیلہ جمال پور، پی اینڈ ٹی کالونی، سندھی کالونی، ابراہیم پورہ، شانتی نگر، پیر گیٹ، کرودھ گاؤ اور گرین پارک کے علاقے شامل تھے۔ چھولا کی لوکیلٹی میں تو انسانی لاشوں کے ساتھ بہت سے جانور بھی کچی سڑک پر مرے پڑے تھے۔ زہریلی گیس کا سب سے زیادہ اثر چھولا اور جے پرکاش نگر پر پڑا تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں حمیدیہ ہاسپٹل میں لائے جا رہے تھے اور المناک پہلو یہ تھا کہ ہاسپٹل میں صرف دو آکسیجن سیلنڈر موجود تھے۔

اخباروں کے رپورٹروں کے مطابق، جھگی جھونپڑیوں میں پڑی لاشوں کی تعداد

بہت زیادہ تھی اور ابھی ان لاشوں کو اُٹھایا نہیں گیا تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق یونین کاربائیڈ کے پانچ افسروں کو پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ ان میں ورکس منیجر مسٹر مکُند بھی شامل تھا۔ جس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ گیس صبح ڈیڑھ بجے نکلنا شروع ہوئی تھی اور دو بجے اس پر قابو پالیا گیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ گیس بارہ بج کر چالیس منٹ پر لیک ہونا شروع ہوگئی تھی اور اس پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا کیونکہ وہ ساری مشینری کام ہی نہیں کر رہی تھی جس سے گیس پر قابو پایا جاسکتا تھا۔

جب سرجُو پریس رپورٹ کے اس حصّے پر پہنچی تو اس کی آنکھیں بُری طرح برسنے لگیں۔

چھولا اور جے پرکاش نگر کے گھروں میں پریس رپورٹر نے پندرہ لاشیں پڑی دیکھی تھیں۔ تین لاشیں جے پرکاش نگر سے باہر کچی سڑک پر پڑی تھیں۔ ان میں ایک لاش ایک لڑکی کی تھی، جس نے رنگ دار کپڑے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور جس کی دائیں کلائی میں کانچ کی چھ چمکتی ہوئی چوڑیاں تھیں۔ اس سے یہ ظاہر تھا کہ اسے زندگی کی خوبصورتی اور رنگوں سے کتنا پیار تھا۔ سرجُو کو لگا جیسے اس کے سامنے اخبار کا صفحہ نہیں تھا، بلکہ وہ کچّی سڑک تھی، جس پر اس خوبصورت معصوم لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ سرجُو جیسے اب اپنے پلنگ پر پھیلے اخبار کے پہلے صفحے کو نہیں دیکھ رہی تھی، بلکہ ایک کچی سڑک کے کنارے کھڑی ہوکر، صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں اس معصوم لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو زندگی کی تلاش میں بھٹکتی بھٹکتی تھک ہار کر راستے میں ہی گر کر مرگئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سڑک پر ایک لاوارث لڑکی نہیں بلکہ وہ خود مری پڑی تھی۔ وہ ایک ایسے لشکر میں شامل تھی جو زندگی کی ناانصافیوں، کرختگیوں، اور بدصُورتیوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اس طویل جنگ میں اس لشکر کے بے شمار سپاہی کام آئے تھے اور سرجُو اس ہارے ہوئے لشکر کی آخری سپاہی تھی، جو پے بہ پے زخم کھا کر نڈھال ہوگئی تھی اور آخر میدان میں چِت گر گئی تھی۔

بس اس سے آگے سرجو کچھ نہیں پڑھ سکی۔

اسے لگا اخبار کے اسی صفحے پر آنند کا چہرہ ڈولنے لگا تھا، سمندر کے پانی میں، سمندر میں ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے وہ کہے جا رہا تھا۔ "زندگی میں اُتنا بُرا اور کچھ بھی نہیں ہے جتنا کہ اپنے آپ کو ایک دم مجبور اور بے بس سمجھنا۔ تمھاری مجبوری اور بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں لوگ۔ وہ تمھیں اور بھی زیادہ مجبور بنا ڈالتے ہیں۔ جسے تم اِمپوٹینس سمجھتے ہو وہ سوائے مجبوری کم ہمتی اور بے بسی کی شدّت کے اور کچھ بھی نہیں۔

"جب کوئی سیکس میں اِمپوٹینٹ ہو جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بنیادی طور پر بھی اِمپوٹینٹ ہو۔ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ بھی اِمپوٹینٹ بنا دیتا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ میری اس سچوایشن کا امپوٹینسی سے کیا سمبندھ ہے؟"

"اس لیے کہ تمھاری آج کی رات بھی بر باد ہو جائے گی۔"

"ہو جائے تمھیں کیا؟"

"جانتی ہو اس وقت تمھارے ہسبینڈ کی مینٹل کنڈیشن کیا ہے؟"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔"

"وہ پاگل ہو جائے گا۔"

"وہ پاگل ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن تم مجھے ضرور پاگل کر دو گے۔"

"تم تو پاگل ہو ہی سرجو۔ مجھ سے زیادہ تمھیں کون جانتا ہے۔" اور پھر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"اور قہقہے لگاؤ۔ اور لگاؤ قہقہے۔" وہ چیخی۔

سرجو کو لگا آنند کے قہقہے دھیمے پڑتے جا رہے تھے اور اس کے سامنے پھیلا اخبار کا صفحہ سوکھنے لگا تھا اور پھر اخبار کا صفحہ پوری طرح سے سوکھ گیا اور اس پر پھیلے آنند کے چہرے کے کنٹورز دھیرے دھیرے مٹنے لگے تھے۔

سرجو نے اخبار کو طے کر کے ایک طرف ڈال دیا اور اسے لگا جیسے اس کے آنے سے اس چھوٹے سے امن چین والے گھر میں ایم آئی سی زہریلی گیس اچانک لیک کر گئی

تھی اور یونین کاربائیڈ کی گیس کی زد میں آئے سیکڑوں بچّے اپنی زندگی بچانے کے لیے جیسے اپنے گھروں سے بھاگے تھے۔ اُسی طرح اُس کے آنے سے جو گیس لیک ہوئی تھی اُس سے بچنے کے لیے گڈّو بھی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اگر تو وہ ہوا کے مخالف رُخ کی طرف بھاگا ہوگا تو بچ جائے گا ورنہ اُن سینکڑوں بچّوں کی طرح مرجائے گا جو ہوا کے رُخ کے ساتھ بھاگے تھے۔

اب جبکہ سرجُو کی دونوں آنکھوں کے آنسو سُوکھ گئے تھے اُس کی تیسری آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔

کچھ آنسو اپنے لیے۔

کچھ گڈّو کے لیے۔

اور کچھ آنند کے لیے۔

اسی لمحہ، گھر کے باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

دیپک شرما گڈّو کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن جارہا تھا۔

دوپہر کو واپس آیا تھا دیپک شرما۔

گڈّو کا کچھ پتا نہیں لگا تھا۔

وہ بہت اُداس اور ڈی پریسڈ لگ رہا تھا۔

سرجُو کچھ دیر پہلے ہی نہاکر باتھ رُوم سے باہر نکلی تھی۔

سرجُو کو لگا ماں بیٹے میں جھگڑا ہورہا تھا۔ اس کا من چاہا کہ وہ بیڈرُوم سے نکل کر ان کی گفتگو سُنے۔ لیکن اس نے ارادہ بدل دیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد دیپک شرما نے سرجُو سے کہا۔

"ماں کہتی ہے کہ میں گڈّو کو فوراً تلاش کرنے جاؤں۔"

"وہ ٹھیک کہتی ہیں۔"

"تم بھی یہی کہتی ہو؟"

"ہاں۔ گڈّو نے میری ہی وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ اسے ضرور واپس لانا چاہیے۔"

"مجھے دو تین دن لگ سکتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"تم کیا کرو گی؟"

"جو میں پچھلے تین دنوں میں کرتی رہی ہوں۔"

"کھاٹ توڑتی رہو گی؟"

"آپ چاہیں تو سڑک پر پتھر بھی توڑ سکتی ہوں۔"

"تم تو بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔"

"میرے بھائی نے بھی تو آپ سے یہی کہا تھا۔"

"اس نے غلط تو نہیں کہا تھا۔"

"اسی لیے میں بھی اسے صحیح ثابت کرنا چاہتی ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد سرجُو نے گھر کے باہر اپنی ساس کے ساتھ دیپک شرما کو وداع کیا اور جب اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو وہ اسے بائی بائی کہتے ہوئے اندر آگئی۔

سرجُو کو لگا جیسے اس کی زندگی ایک دم بری طرح سمٹ گئی تھی اور ساری سیمائیں اس گھر میں اور گھر کے بھی ایک چھوٹے سے کمرے میں سکڑ کر دبک گئی تھیں۔ سرجو ایک گنگناتی ہوئی پوتر جل کی ندی سے ایک چھوٹا سا تالاب بن گئی تھی۔ جس میں پانی کی ایک پتلی لکیر دلدل بھرے کناروں کے اندر، اپنا بیکار سا وجود سمیٹے بڑی ہی مری ہوئی رفتار سے بہہ رہی تھی۔

ایک ندی فوراً ہی ایک دلدل بھرا نالہ بن جائے گی یہ تو سرجُو نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اُس دن بھی یعنی جب کوئی سال بھر پہلے اس کا آنند سے جھگڑا ہوا تھا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی آنند سے نہیں ملے گی۔ لیکن ہُوا اُس کا بالکل اُلٹ۔ وہ اگلی صبح ہی اس کے گھر چلی گئی تھی جیسے آنند سے کبھی اس کا جھگڑا ہوا ہی نہیں تھا اور اس نے کبھی یہ فیصلہ کیا ہی نہیں تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے اُس

سے الگ ہو گئی تھی۔

سرجو کی ہلکی سی دستک پر جب فرسٹ فلور کے فلیٹ کا دروازہ آنند نے کھولا تھا، تو اس نے پوچھا تھا۔

"تم جا رہے تھے کہیں!"

"ہاں؟"

"کہاں؟"

"یہ پوچھنے کا حق تو تم نے واپس لے لیا تھا کل۔"

"وہی حق تمھیں لوٹانے آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آنند کے سینے سے لگ گئی تھی اور اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔"

آنند نے نہ تو کوئی جواب ہی دیا تھا اور نہ ہی اپنا بازو اس کی پیٹھ پر رکھا تھا جیسے وہ اکثر رکھا کرتا تھا۔

"اپنا ہاتھ بھی نہیں رکھو گے میری پیٹھ پر؟"

آنند پھر خاموش رہا تھا۔

سرجو نے اپنی دونوں باہیں اس طرح کس دی تھیں آنند کی گردن کے گرد کہ اس کی سانس گھٹنے لگی تھی۔

"میں گلا گھونٹ دوں گی تمھارا۔"

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

"میں تمھیں جان سے مار دوں گی!"

آنند پھر بھی خاموش رہا تھا۔

اور پھر سرجو نے اچانک اپنی باہیں اس کی گردن سے الگ کر لی تھیں اور اپنا سر اس کے سینے سے اٹھا لیا تھا اور یک لخت اس کے پاؤں پر گر گئی تھی۔

"مجھے معاف نہیں کرو گے تم ؟"

آنند نے اس کی باہنیں پکڑ کر اسے اُٹھا لیا تھا اور اس کی گیلی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔

بولا وہ پھر بھی کچھ نہیں تھا۔

اور پھر آنند کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے اور اس کے گرم گرم آنسو سرجُو کے گرم گرم آنسوؤں میں تحلیل ہو کر اس کے گالوں پر پھیل گئے تھے۔

سرجو کو لگا جیسے کسی جوالامُکھی کے دہانے سے اُبلتا ہوا لاوا نکلا تھا اور اس نے اس کے تمام وجود کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اُسی گرم گرم لاوے کا ایک حصہ بن چکی تھی اور جب وہ لاوا ٹھنڈا ہو گا تو وہ بھی اس ٹھنڈے لاوے میں دبی ایک ممی بن چکی ہوگی۔ جسے اپنی محبت کے غار میں رکھ دے گا آنند اور پھر بِٹر بِٹر دیکھتا رہے گا اسے زندگی بھر۔

جھگڑے کے بعد اگلی صبح کو آنند سے مل کر سرجُو کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آنند کے بغیر اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ زندگی کی اس منزل پر آ گئی تھی جہاں اس کا کوئی اپنا الگ استتِو ہی نہیں رہا تھا۔

سرجُو ایک چھوٹی سی ندی کی طرح ایک اسیم ساگر میں سما گئی تھی۔

یہ تین دن جو سرجُو نے اس گھر میں اکیلے ہی گزارے اس کے لیے بڑے مہتوپورن تھے۔

دیپک شرما کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اگر اُسے اُس گھر کے بارے میں اور اپنے خاوند کے بارے میں واقفیت حاصل کرنی تھی تو اسے اپنی ساس کا وشواس پراپت کرنا چاہیے۔ اُسی سے ہی وہ سب کچھ مل سکتا ہے اُسے جس کی اُسے اس وقت بہت ضرورت ہے۔ سرجُو نے اپنی دو آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس نے اپنی تیسری آنکھ کھولی کہ شاید اُسے کچھ وہ بھی نظر آ جائے جو اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا اب تک۔

شام ہوئی تو وہ خود دیپک کی ماں کے کمرے میں گئی۔ ماں رضائی اوڑھے کھاٹ پر پڑی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہلکی سی بارش ہوگئی تھی اس لیے سردی بڑھ گئی تھی۔

"ماں جی چائے بناؤں؟" سرجو نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا

ماں نے مُنہ سے رضائی ہٹائی۔

"بہت سردی ہوگئی ہے۔"

"میں چائے لاتی ہوں۔"

"میری چائے تو تمھیں پسند بھی نہیں آتی ہوگی؟"

"ایسی بات نہیں۔"

"تمھیں رسوئی کا پتا ہے۔ چائے کی پتی، کھانڈ، دودھ ڈھونڈ لوگی؟"

"آپ فکر نہ کریں میں سب کچھ ڈھونڈھ لوں گی۔" سرجو نے ہنستے ہوئے کہا اور رسوئی میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی پیالی ماں کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"کھانڈ کم ہو تو اور ڈال دوں گی۔"

پیالی سے ایک گھونٹ پی کر ماں بولی۔

"کھانڈ کم ہے۔"

"ایک چمچ اور ڈال دوں؟"

"ڈال دو۔"

سرجو نے اس کی پیالی میں ایک چمچ کھانڈ اور ڈالی اور اُسے چمچ سے اچھی طرح ہلا کر پیالی ماں کو پکڑا دی۔

خود بھی اس کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ چائے پینے لگی۔ چائے اُس نے اپنے ڈھنگ سے بنائی تھی اس لیے اُسے پسند تھی۔ پچھلے تین دنوں میں تو ایک طرح سے چائے اسے ملی ہی نہیں تھی۔

"چائے کیسی ہے ماں جی؟"

"دودھ کم ہے۔"

"اب میں سمجھ گئی کل سے زیادہ دودھ والی چائے دوں گی آپ کو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

چائے پی چکنے کے بعد سرجُو نے ماں سے پوچھا۔

"سردی زیادہ ہو تو ہیٹر لگا دوں؟"

"نہیں رضائی کی گرمی بہت ہے۔"

"رات کے کھانے میں کیا بناؤں؟"

"تم بناؤ گی؟"

"اور کون بنائے گا؟"

"میں جو ہوں۔"

"یہ فرض میرا ہے۔"

"تو تم بنا دو۔ مرچ کم ڈالنا سبزی میں۔"

"کم ہی ڈالوں گی۔ میں خود بھی زیادہ مرچ نہیں کھاتی۔"

"مجھے گڈّو کی بڑی چنتا ہے۔ ابھاگا جانے کہاں چلا گیا؟"

"مجھے بھی چنتا ہے اُس کی۔"

"دیپک اسے کہاں کہاں ڈھونڈے گا۔"

"گئے ہیں تو ڈھونڈیں گے ہی اُسے۔"

"میری ایک بات مانو گی؟"

"آپ کہیے نہ ماں جی، مانوں گی کیوں نہیں۔"

"چلو مندر ہو آئیں۔"

"چلیے۔"

"بہت دُور نہیں ہے۔"

"دُور بھی ہو تو کیا ہے۔ رکشا سے چلیں گے اور واپس آجائیں گے۔"
سرجُو نے ماں کو اچھی طرح شال سے لپیٹ کر رکشا میں بٹھا دیا اور دونوں مندر کی طرف چلیں۔

وہ شِو کا مندر تھا جہاں دیپک کی ماں سرجُو کو لے کر آئی تھی۔ پراچین مندر تھا وہ۔ آنند بھی اگر کبھی مندر جاتا تھا تو شِو جی کے مندر ہی جاتا تھا۔ اور کسی مندر میں نہیں جاتا تھا وہ۔ وہ بچپن ہی سے شِو بھگت تھا۔

ماں نے شِو لنگ کے سامنے ماتھا ٹیکا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سرجُو جب ماتھا جھکا کر اُٹھی تو اسے لگا آنند کہیں سے آکر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم تو کبھی اکیلے مندر نہیں جاتیں۔ آج کیسے آگئی ہو؟ دیپک کو کیوں نہیں لائیں ساتھ؟

میرے ساتھ بھی تو شِو جی کے مندر میں گئی تھیں ایک دن تم اور کہا تھا کہ اب تمھیں کسی بھی مندر جانے کی ضرورت نہیں۔

کیوں؟ میں نے پوچھا تھا۔

تمھیں پانا تھا پا لیا۔ اب شِو جی سے کیا مانگوں گی؟

اب یہاں کیا مانگ رہی ہو؟"

سرجُو نے اپنے پہلو میں ویسے ہی ہاتھ گھمایا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، جس سے اس کا ہاتھ ٹچ کرتا۔

"آخر کیا چاہیے تمھیں مجھ سے؟"

"مُکتی۔"

"وہ نہ تمھیں مل سکتی ہے نہ مجھے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تم صرف بندھنوں میں وشواس رکھتے ہو۔"

"لیکن تم تو بندھن توڑ کر آئی ہو۔"

"کچے بندھن توڑ کر بیڑیاں پہن لی ہیں۔"

اُس سمے ماں نے مندر کا گھنٹہ بجایا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن۔ سرجو کو لگا جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں بجنے لگی تھیں۔ اس سرد موسم میں بھی سرجو کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ بیڑیوں کا ٹھنڈا لوہا اُس کی ٹانگوں کو چھو رہا تھا اور اس کی ٹانگیں ٹھنڈی یخ ہو رہی تھیں۔

سرجو جب ماں کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر گھر لوٹ رہی تھی تو وہ بالکل خاموش تھی۔ کوئی بات نہ کی تھی راستے بھر اس نے ماں سے۔ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتی رہی تھی اور بیڑیوں کے سرد لوہے سے ٹھنڈی ہوتی ٹانگوں کو سہلاتی رہی تھی۔

رات کو ماں کے کمرے میں ہی کھانا کھاتے ہوئے سرجو نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں مانیں گی آپ؟"

"پوچھو برا کیوں مانوں گی میں۔"

"گڈو کی ممی کو کیا ہوا تھا؟"

"اُس نے آتم ہتیا کر لی تھی۔"

یہ جواب دیتے ہوئے ماں کا گلا بھر آیا تھا اور سرجو کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔ کھشن بھر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آتم ہتیا کیوں کر لی تھی؟"

"پتی پتنی میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"جھگڑے کا کوئی کارن بھی تو ہوگا۔ آتم ہتیا کرنا آسان نہیں ہوتا ماں جی۔"

"اب کیا بتاؤں؟"

"من نہیں کرتا تو رہنے دیجیے۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔"

اس کے بعد اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور رسوئی میں رکھنے چلی گئی۔ پھر اس نے ہاتھ صاف کیے اور تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے دوبارہ ماں کے کمرے میں آ گئی۔

"میں نے ربڑ کی بوتل میں گرم پانی بھر دیا ہے، رضائی میں رکھ لیں۔"
"اتنی ٹھنڈ تو نہیں۔"
"بارش ہو گئی تو سردی بڑھ جائے گی۔"
سرجو دوبارہ رسوئی میں گئی اور ربڑ کی بوتل میں گرم پانی بھر کر لے آئی۔
بوتل اس نے خود ہی ماں کی رضائی میں رکھی اور پوچھا۔
"گرم گرم دودھ لے آؤں؟"
"نہیں، دودھ نہیں پیوں گی اس سمے۔"
تو چائے لے لیجیے۔"
"پھر نیند نہیں آئے گی۔"
"تو رسوئی بند کر کے میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں؟"
"تھوڑی دیر بیٹھو پھر چلی جانا۔"
سرجو اس کی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ لیکن اسے وہاں بیٹھنا کوئی بہت اچھا نہیں لگا۔
ماں نے خود ہی بات شروع کی۔
گڈو کے پیدا ہونے کے تین سال تک تو میاں بیوی میں بہت بنتی رہی تھی۔ ایک سال کے لیے تو دیپک اسے اودھم پور بھی لے گیا تھا جہاں اس کی نوکری تھی۔
"پھر؟"
"بس پھر وہ اسے میرے پاس چھوڑ گیا اور دو سال تک چھٹی پر بھی نہیں آیا۔"
"کیوں؟"
"بھگوان جانے کیا بات تھی۔ شانتی اسے خط لکھتی تھی تو وہ جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ ہاں ہر مہینے میرے نام منی آرڈر ضرور بھیج دیتا تھا۔"
"بڑی حیرانی ہو رہی ہے مجھے یہ سن کر۔"
"پھر منی آرڈر آنے بھی بند ہو گئے۔ گھر کے گزارے میں بھی مشکل ہونے لگی اور پھر کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دن اپنا تمام سامان لے کر وہ واپس گھر آ گیا۔"

"گھر کیوں آ گئے وہ؟"

"سرکار نے نوکری سے نکال دیا تھا، یہ مجھے اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ شانتی کو بتایا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔"

گڈّو کی ممّی نے بھی آپ سے کبھی بات نہیں کی؟"

"نہیں۔ وہ تو ایک دم گم صُم ہو گئی تھی۔ بڑا دُکھ ہوا تھا شاید اُسے۔"

"دُکھ کی بات تو تھی ہی۔"

"بس یہی دُکھ شانتی کو کھا گیا۔ دونوں میں اکثر جھگڑا رہتا۔ کبھی کبھی تو دونوں کھانا بھی نہیں کھاتے۔ ان کے کارن مجھے بھی بھوکا رہنا پڑتا۔ میں کبھی دخل دینے کی کوشش کرتی تو دیپک مجھے بھی ڈانٹ دیتا۔ پھر میں نے بھی اس سے زیادہ بات کرنی چھوڑ دی۔ وہ رات کو بوتل کھول کر بیٹھ جاتا اور سب کو گالیاں دیتا۔"

"شانتی بہن جی بھی نہیں ٹوکتی تھیں؟"

"ایک دو بار اس نے ٹوکا تو دیپک نے اُسے بُری طرح مارا۔ اس کے بعد وہ ایک شبد نہیں بولی کبھی۔"

"گڈّو پر بھی تو اس کا اثر ہوا ہو گا۔"

"گڈّو اپنی ماں سے زیادہ جُڑتا گیا اور باپ سے کٹتا گیا۔ باپ سے تو وہ بولتا بھی نہیں تھا اب۔"

"گھر تو اسی طرح تباہ ہوتے ہیں ماں جی۔"

"جس رات شانتی نے آتم ہتیا کی اس رات وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی اور کہتی رہی کہ میں گڈّو کا زیادہ دھیان رکھا کروں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری مجھ پر ڈال رہی تھی اور خود اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"آپ کو شک نہیں ہوا کہ وہ کیوں ایسی باتیں کر رہی تھیں۔"

"نہیں۔ وہ تو اگلی صبح جب وہ دیر تک نہیں جاگی تو میں اس کے کمرے میں گئی۔ وہ بستر میں مری پڑی تھی۔"

"دیپک صاحب کہاں تھے؟"

"وہ تو صبح سویرے ہی کہیں نکل گیا تھا۔ جب وہ گھر لوٹا تو گلی محلے کے لوگ دروازے پر کھڑے تھے۔ پولیس شانتی کی لاش کو اسپتال لے گئی۔ کہیں شام کو لاش واپس ملی تھی۔ جب ہم لوگ شمشان سے آئے تو اندھیرا ہونے لگا تھا۔ رات کو گڈّو میری چھاتی سے لگا جاگتا رہا اور سسکیاں بھرتا رہا۔ وہ اپنے باپ سے اتنا ڈر گیا تھا کہ کئی دنوں تک اس کے سامنے نہیں گیا۔"

"کاش مجھے یہ سب باتیں معلوم ہوتیں!" سرجو نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"معلوم بھی ہوتا تو تم کیا کر لیتیں؟"

"شاید کچھ بھی نہیں۔ تقدیر بہت بڑی چیز ہے ماں جی۔"

"بنا بھاگیہ کے کچھ نہیں ہوتا بیٹی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔"

جب سرجو بڑی اداس اور نڈھال سی ہو کر ماں کی کھاٹ سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئی تو آدھی رات ہونے کو تھی۔ وہ اپنے ٹھنڈے بستر پر بنا کپڑے بدلے ہی لیٹ گئی۔ بہت دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی گڈّو کے بارے میں۔ ایک معصوم بچّہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ تقدیر اسے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھلائے گی، کون جانتا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پاؤں بہت دیر میں جا کر گرم ہوئے اور تبھی کہیں جا کر اسے نیند آئی۔

مگر سو کہاں سکی تھی وہ! اُسے اکیلی دیکھ کر آنند گھس آیا تھا اس کے کمرے میں۔

"سُن آئی ہو بڑھیا سے اس کی رام کتھا؟"

"تم پھر آپہنچے؟ مندر میں کم پریشان کیا تھا کیا؟"

"پریشان تو تم خود ہوتی ہو اور الزام دھرتی ہو مجھ پر؟"

"میں کسی پر الزام نہیں دھرتی۔"

"تقدیر پر تو دھرتی ہو؟"

"تقدیر پر بھی نہیں۔"

"میری کالی زبان کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"اسی کی تو ماری ہوئی ہوں۔ اچھا ہوتا اگر تمھاری کالی زبان کاٹ ڈالتی اُس روز۔"

"تو اب کاٹ ڈالو۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں۔"

"اب تو فائدے اور نقصان کا بہت خیال آ رہا ہے تمھیں۔ جب دیپک سے بیاہ رچایا تھا تب تو تمھیں پل بھر بھی سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔"

"جب تو ایک دم اندھی ہو گئی تھی میں۔"

"اور اب تو سنسار بھر کی جوت آ گئی ہے تمھاری آنکھوں میں۔"

یہ کہہ کر آنند زور سے ہنسا بھی تھا۔ اس کی ہنسی میں جو تیز طنز تھا وہ ایک بھالے کی طرح اُتر گیا تھا سرجو کی رُوح میں۔ وہ ایک گھائل جانور کی طرح تڑپی اور پھر زور سے چیخی۔

"تم دفع ہو گے یا دھکے مار کر نکالوں تمھیں کمرے سے؟"

"تم دھکے نہیں مار سکو گی مائی ڈیر سرجو یہی تمھاری بدنصیبی ہے۔ لیکن بستر سے باہر مت نکلو۔ پاؤں پھر ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ اور پھر نیند نہیں آئے گی اور رات بھر جاگتی رہو گی۔"

"نو ہیل وِدھ یُو۔"

"بہت دنوں کے بعد سنا ہے یہ جملہ۔ لو تو ہم جا رہے ہیں۔ ہیو سویٹ ڈریمز۔" پھر سرجو کو لگا جیسے سارا کمرہ آنند کے قہقہوں سے گونجنے لگا تھا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور کروٹ بدل کر مُنہ دیوار کی طرف کر لیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوئچ اون کیا۔ روشنی ہوئی تو کمرہ اور بھی بھیانک لگنے لگا۔ اُسی کھشن اس نے دیپک کی ماں کے کھانسنے کی آواز سُنی۔ ماں بھی جاگ رہی تھی اب تک۔ شاید اُس کے ٹھنڈے پاؤں اب تک گرم نہیں ہوئے تھے۔

تین دسمبر کا دن اور اس کی رات دونوں بہت اذیت ناک رہے سرجو کے لیے۔ کمرے کی روشنی رات بھر جلتی رہی اور سرجو ٹھنڈے پانو سیکڑے اور کمبل میں منہ ڈھانپے نیند کی پناہ گاہ ڈھونڈتی رہی۔ وہ تو جب اخبار والے نے گیٹ کے باہر سے رول کیا ہوا اخبار، اندر پھینکا تو اس کی آواز سے سرجو کی نیند ٹوٹی۔ وہ بستر سے باہر نکلی اور شال اوڑھ کر باتھ روم چلی گئی۔ پھر اس نے کچن میں جا کر چائے بنائی اور اسی دوران اخبار کے پہلے صفحے کی سرخیوں کو دیکھا۔ بھوپال گیس کا المیہ ہی سب سے بولڈ ہیڈ لائن تھی۔ دیپک کی ماں جاگ گئی تھی اور باتھ روم سے اس کے کھنکارنے کی آواز آرہی تھی۔ سرجو نے اپنی چائے اپنے کمرے میں بستر کے نزدیک پڑی تپائی پر رکھی، اخبار بستر پر پھینکا اور پھر دوسرے کمرے میں جا کر ماں کو چائے دے کر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ بستر میں بیٹھ گئی، کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور اخبار سامنے پھیلا کر بھوپال گیس سے متعلق تازہ خبروں کو پڑھنے لگی۔

بھوپال۔ دسمبر چار (منگل وار)

وزیر اعظم راجیو گاندھی بنگلور سے بھوپال آئے تھے، گیس سے برپا تباہی کا جائزہ لینے۔ گیس سے ہوئی تباہی کے نوّے منٹوں کی سروے کے بعد انھوں نے بھوپال ایرپورٹ پر اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا، کہ منگل کی دوپہر تک شہر کے مختلف اسپتالوں میں گیس سے متاثر ہوئے بیس ہزار لوگوں کو طبی امداد مل چکی تھی۔ وزیر اعظم نے یہ بھی بتایا کہ گیس سے متاثر لوگوں کے لیے دواؤں کی کمی نہ ہوگی اور ان لوگوں کو پھر سے بسانے اور انھیں پوری سہولیات دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ وزیر اعلا شری ارجن سنگھ نے، جو اس پریس کانفرنس میں موجود تھے، یقین دلایا کہ فیکٹری کے مالکوں سے پورا پورا معاوضہ لینے کے لیے بھرپور قدم اٹھائے جائیں گے۔

وزیر اعظم کے جانے کے بعد، سرکاری کرمچاریوں کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش تھا، وہ تھا یونین کاربائیڈ فیکٹری کے نزدیک مرے ہوئے جانوروں کو اٹھانا، جو بڑی تعداد میں اِدھر اُدھر پڑے تھے اور ان سے سڑاند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کو اندیشہ

تھا کہ اگر ان سڑتے گلتے مردہ جانوروں کو فوراً نہ اُٹھایا گیا، تو بڑی بھاری وبا پھیل جائے گی۔

بھوپال کے لوگ اس قدر خوف زدہ اور ہراساں تھے، کہ وہ مختلف ٹولیوں میں اپنے سروں کے اوپر چادریں پھیلائے، جنھیں چار چار آدمی چاروں کونوں سے سنبھالے ہوئے تھے، شہر کے ان علاقوں میں جو گیس سے متاثر نہیں ہوتے تھے، ہر قسم کی چیزیں خیرات کے طور پر مانگ رہے تھے۔

لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ اس بین الاقوامی کمپنی کے لوگ ایک دم پتھر کی طرح بے حس تھے اور ان کے ہونٹوں پر ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔

اخبار کو سامنے پھیلائے سرجُو نے آنکھیں بند کرلیں اور وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ بھوپال کی یونین کاربائیڈ فیکٹری سے لیک ہوئی گیس یہاں تک پہنچ گئی تھی اور گیس میں گھُلا ہوا زہر اس کے گھر کی ساری فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اُسے لگا کہ اس کی آنکھیں بُری طرح دُکھنے لگی تھیں اور اس کا گلا گھُٹا جا رہا تھا۔ وہ ایک دم چیخی۔

"بچاؤ مجھے۔"

دیپک کی ماں نے اس کی چیخ سُنی تو گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا بہو؟"

"کچھ نہیں ماں جی۔"

"چیخ تو تمھاری ہی تھی۔"

"ہاں، کوئی بات نہیں آپ آرام کیجیے۔"

ماں تھوڑی دیر کمرے میں رُک کر آخر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سرجُو دن بھر پریشان رہی، لیکن اس نے دیپک کی ماں کو اس کا احساس نہ ہونے دیا۔

وہ بے چاری تو ویسے ہی بہت پریشان تھی۔

رات کو اس نے بجلی بھی نہیں بجھائی۔ اندھیرے سے اسے بے حد ڈر لگنے لگا تھا۔ رات بھر بجلی کی تیز روشنی میں وہ کروٹیں بدلتی رہی اور طرح طرح کے وسوسے اسے گھیرے رہے۔

اگلی صبح کا اخبار پڑھ کر وہ اور بھی زیادہ اُداس اور پریشان ہو اُٹھی۔

بھوپال، دسمبر ۵ (بدھوار)

بھوپال کے شہریوں نے میتھل آئی سوسائینٹ کی زہریلی گیس سے ہلاک لوگوں کو اپنی عقیدت پیش کی اور سوموار کی صبح کو بہت بڑی تعداد میں مرے۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کو آگ کے شعلوں کے سپرد کیا اور قبرستانوں میں دفنایا۔ ایک ہی خاندان کے کئی لوگوں کو ایک ہی چتا میں جلانا اور خاندان کے کئی افراد کو ایک ہی جگہ دفنانا ایک دل کو دہلا دینے والا منظر تھا، جسے دیکھنا بھی بے حد اذیت کا حامل تھا۔ بھوپال کے شہری تمام دن مُردوں کی بہت بڑی تعداد کو، زمین کے سپرد کرنے کے لیے جان توڑ کوشش میں مصروف رہے۔

اخبار کے ایک نمائندے نے بتایا کہ اس کا شہر کے مختلف علاقوں کے قبرستانوں میں جانا اور وہاں کے دلدوز منظر کو دیکھنا اُس کے لیے ایک جاں کاہ تجربہ تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں تازہ کھودی گئی قبروں میں دفنائے جانے والوں کے لیے ایک قبرستان میں کافی مٹّی بھی نہیں تھی۔ قبروں کو بھرنے کے لیے، بھوپال ٹاکیز کے نزدیک بارہ باغ قبرستان کے باہر پڑے مٹّی کے ڈھیروں کو اُٹھا کر قبروں کو بھرا گیا تھا۔ اس قبرستان میں بیس گورکن لمحہ بہ لمحہ لاشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے، قبریں کھودنے کے کام کے لیے کافی نہیں تھے۔ یہ بڑی ہی المناک خبر تھی کہ باغ منشی حسن اور دوسرے علاقوں کے لوگ تاج المساجد کے سایے میں، قبریں کھودتے رہے تھے۔ کہ گئی رات لائی جانے والی لاشوں کو، جن کی تعداد تین سو تھی، سپردِ خاک کیا جا سکے۔

قبرستان میں نمازِ جنازہ ادا کرنے کا کام بھی نزدیک کی قلندر شاہ مسجد کے پیش امام نے سرانجام دیا تھا۔ لیکن جب جنازوں کی ایک بھیڑ اکٹّھا ہو گئی تو اس علاقے

بستی کے رہنے والوں نے نمازِ جنازہ بھی خود ہی ادا کی۔

اس علاقے کے ایک درزی نے اکیلے ہی دو سو سے زیادہ کفن سیئے تھے، کئی تازہ کھدی ہوئی قبریں، اپنے بھیانک مُنہ کھولے آنے والے مکینوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

اس خبر نے تو سرجو کو ایک دم توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے اخبار کا پہلا ہی صفحہ پڑھ کر اخبار کو فرش پر پھینک دیا تھا اور خود اپنے چہرے کو شال کا پہلا ڈھک کر خاموش لیٹ گئی تھی۔ جانے کیوں اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ ایم آئی سی گیس، جو تین دن پہلے بھوپال کی فضا میں بکھری تھی، اب ہوا کی لہروں کی مدد سے جالندھر پہنچ گئی تھی اور پنجاب کا ایک پورا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد سارے شہر کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر گلیوں اور سڑکوں میں آ جائیں گے اور سمتوں کا دھیان کیے بغیر ادھر اُدھر بھاگنے لگیں گے۔ باپ بیٹوں سے جُدا ہو جائیں گے۔ بھائی بہنوں کو چھوڑ دیں گے۔ خاوند اپنی بیویوں سے الگ ہو جائیں گے اور یہاں اس شہر میں بھی جنازے اٹھیں گے، چتائیں جلیں گی اور قبریں مجبور اور بے سہارا انسانوں کو آخری پناہ دیں گے۔

اور جب سرجو کی ذہنی کیفیت اس کے لیے اتنی زیادہ ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی، ٹھیک اسی لمحہ باہر گیٹ پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ کچھ لمحوں تک وہ اس کرخت آواز کو سنتی رہی اور پھر بستر سے اٹھی، کندھے پر شال ڈالا اور باہر آ گئی۔ گیٹ کھولا باہر تار والا کھڑا تھا۔

اس نے تار لے کر فوراً لفافہ کھولا۔ چنڈی گڑھ سے اس کے بھائی گور بخش کا تار تھا۔ اس کے پتا جی کی حالت نازک تھی۔ اس نے تار پھاڑ دیا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

دیپک کی ماں اس وقت باتھ رُوم میں تھی، اس لیے اس نے گیٹ پر دی گئی کرخت دستک کو نہیں سنا تھا۔

اگلے دن کی خبر بڑی مختصر تھی۔

بھوپال۔ دسمبر ۶ (جمعرات)

وزیر اعلا نے جسٹس کے این سنگھ کی سربراہی میں ایک جوڈیشیل انکوائری کمیشن کا اعلان کیا تھا۔ یہ کمیشن بھوپال میں زہریلی گیس کے لیک ہونے کی جانچ کرے گا اور اپنی رپورٹ تین ماہ کے اندر پیش کرے گا۔

اس اعلان کے بعد وزیر اعلا دونوں کے لیے کھجوراہو چلے گئے تھے جہاں وزیر اعظم آنے والے تھے۔

اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں تھی اخبار میں۔

سرجُو نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے آپ سے بولی۔

"ایم آئی سی گیس، شاید یہاں تک پہنچتے پہنچتے کمزور ہو جائے۔"

اور پھر وہ کچن میں چلی گئی۔ اپنے لیے اور دیپک کی ماں کے لیے چائے بنانے۔

کیپٹن دیپک شرما چھ دن گھر لوٹا تھا جگہ جگہ دھکے کھا کر۔ گڈّو کہیں نہیں ملا تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی اُسے۔ ایک دم ٹوٹا ہارا واپس آیا تھا دیپک۔ سینس آف گلٹ بھی زیادہ شدید ہو گئی تھی اس کی۔ ان تین دنوں میں وہ اپنے آپ کا تجزیہ بھی کرتا رہا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ اس نے سرجُو سے شادی کرنے میں بہت جلد بازی کی تھی۔ اس نے اپنے آپ میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر لوٹتے ہی وہ سرجُو سے معافی مانگے گا کیونکہ اس کا بی ہیویر ٹھیک نہیں رہا تھا اس سے۔ سرجُو کو ایڈجسٹ کرنے میں وقت لگے گا۔ یہ بات بھی دیپک کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سرجُو کے بھائی نے اس سے دھوکا کیا تھا اور اپنے پتا کی جائداد کے لالچ میں وہ ایک طرح سے اپنی بہن کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سرجُو لاعلمی میں ہی اپنے بھائی کی سازش اور اپنے والدین کی مجبوری کا شکار ہوئی تھی۔ کار کو گھر کی طرف گھماتے ہوئے وہ یہی دُعا کر رہا تھا کہ کاش جب اس کی کار گھر کے گیٹ پر رُکے تو سامنے سرجُو کھڑی ہو۔ وہ بنا ایک لفظ بھی بولے سرجُو سے معافی مانگے گا اور پھر اس کی کمر میں بازو

ڈال کر اسے اندر لے جائے گا اور اسے چوم چوم کر نڈھال کر دے گا۔ بڑا ہی ایکسائٹیڈ ہو رہا تھا کیپٹن دیپک شرما گلیوں میں سے کار کو گھماتے ہوئے۔

اور جب اس نے گیٹ کے سامنے کار روکی تو اس کی ماں گیٹ کھول رہی تھی۔ دیپک شرما کو ذہنی طور پر بڑا سخت جھٹکا لگا۔ وہ اس سچوایشن کے لیے تیار نہیں تھا۔

"گڈو ملا ؟"

"ڈکی میں بند ہے۔ نکال لو حرام زادے کو" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

اور جب وہ ماں کی طرف بالکل دھیان نہ دیتے ہوئے گھر کے اندر جانے لگا تو ماں نے چیختے ہوئے کہا۔

"میرے سارے گہنے لے گیا ہے گڈو۔"

"کیا کہا۔ تمھارے سارے گہنے لے گیا ہے وہ؟"

"ہاں بیٹے" ماں زور زور سے رونے لگی۔

"تمھارا یہی علاج ہے" دیپک نے جواب دیا۔

ماں بیٹے کی گفتگو سن کر سرجو باہر آ گئی تھی۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں"

"سنا ہے ماں کیا کہہ رہی ہے؟"

"آج صبح کی ہی تو بات ہے۔ اندر آؤ بتاتی ہوں"

سرجو اور دیپک کے ساتھ ماں بھی اندر آ گئی۔ سرجو کو لگا جیسے دیپک واقعی ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ترس آ گیا دیپک پر۔

اسے پانی کا گلاس دیتے ہوئے وہ چائے کی پیالی بنانے کچن میں جانے لگی تو دیپک نے کہا۔

"چائے رک کر پیوں گا تم پہلے یہ زیوروں والی بات بتاؤ" ماں پاس بیٹھی دھیرے دھیرے سبک رہی تھی۔

"اُس وقت تو چھاتی سے لگائے رکھتی تھی حرام زادے کو۔ اب بہاتی رہو آنسو۔"

"اس میں ماں جی کا قصور ہے۔ اِن سے اس طرح کیوں بولتے ہو؟"

"تو کس کا قصور ہے؟"

"آپ کا؟"

"میں ہی دشمن ہوں سب کا۔ تمھارا بھی، ماں کا بھی اور اس حرام زادے کا بھی۔"
سرجو کہنا تو چاہتی تھی کہ دیپک ہی دشمن تھا سب کا لیکن وہ بولی نہیں سچوایشن پہلے ہی بہت خراب تھی۔

"اتنے دن نہیں معلوم ہوا تمھیں کہ وہ گھر سے تمھارے زیور لے کر بھاگا ہے؟"
اس نے ماں سے پوچھا۔

"نہیں۔" یہ جواب دیتے ہوئے ماں نے نفی میں سر بھی ہلا دیا۔

"آج صبح ہی ماں جی نے کہا کہ میں ان کا ٹرنک کھول کر زیوروں والی پوٹلی نکالوں۔ میں نے جب ان کے کئی بار کہنے کے باوجود ٹرنک نہیں کھولا تو انھوں نے خود ہی ٹرنک کھولنے کی کوشش میں کُنڈے کو ہاتھ لگایا تو اس میں تالا نہیں تھا۔ انھوں نے گھبراہٹ میں مجھے آواز دی۔ میں فوراً ہی سٹور میں پہنچی۔ ماں جی رو رہی تھیں۔ انھوں نے ٹرنک کے کُنڈے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اوپر رکھے سبھی ٹرنکوں کو اُٹھا کر نیچے رکھا اور ماں جی کا ٹرنک کھولا۔ ٹرنک میں رکھے کپڑے اور دوسری چیزیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ انھوں نے مجھے ایک ایک چیز باہر نکالنے کے لیے کہا۔ میں نے سب کپڑے باہر نکال دیے اور ان کی تہیں بھی اُدھیڑ دیں۔ ٹرنک میں پڑی ہر چیز نکال کر فرش پر ڈال دی۔ زیوروں والی پوٹلی غائب تھی۔"

"وہ نامراد سب کچھ لے کر بھاگ گیا تھا۔" ماں ایک بار زور سے چیخی۔

"سر پہ بھی تو تمھیں نے چڑھا رکھا تھا۔"

"بیڑہ غرق ہوگا اس کا۔" ماں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا تو غرق ہوگیا ہے۔" دیپک بولا۔

سرجو چپ چاپ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اسے بھی اس گھٹنا کا بہت افسوس تھا۔ لیکن وہ جو ہمدردی تھی اسے گڈو سے وہ پھر بھی کم نہیں ہوئی۔ جانے کیوں وہ اسے پھر بھی بے قصور ہی سمجھتی تھی۔ وہ کچن میں چائے بناتے ہوئے ماں بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔ دیپک اونچی آواز میں بول رہا تھا اور ماں صرف روئے جا رہی تھی اور بیچ بیچ میں کوئی ادھورا سا جواب دے دیتی تھی۔

وہ شام اور وہ رات بڑی ٹینس رہی سب کے لیے۔ ماں مُنہ سر ڈھانپ کر بستر پر پڑی رہی اور دیپک اپنے کمرے میں بیٹھا شراب پیتا رہا۔ سرجو کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ کئی کئی بار پڑھے ہوئے اخبار کو پڑھتی رہی۔ ایک بار دیپک سے پوچھا اس نے۔

"کیا بناؤں کھانے میں؟"

"جو جی چاہے بنا لو لیکن مجھے بھوک نہیں۔"

سرجو نے بحث نہیں کی۔ اسے تو کمرے سے اُٹھ جانے کا کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ ایک بار ماں کے کمرے میں گئی۔ ماں بدستور مُنہ سر ڈھانپے بستر میں پڑی تھی۔ سرجو نے ایک آدھ بار پکارا بھی لیکن ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سرجو کچن میں وقت کاٹتی رہی اور دیپک شراب پیتا رہا اور اپنے بیٹے کو گالیاں دیتا رہا۔

دیپک ضرورت سے زیادہ پی کر بھوکا ہی سو گیا تھا۔ سرجو بھی کچن کی چیزیں سنبھال کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ماں کو اس نے پھر بھی دو ایک بار کچھ کھانے یا دودھ ہی پی لینے کو کہا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ سرجو نے یہ سوچ کر کہ ماں کو سردی نہ لگے گرم پانی کی بوتل اس کے بستر پر رکھ دی تھی۔ لیکن ماں بولی کچھ نہیں تھی۔ جانے کیوں سرجو کو لگا کہ ماں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

آدھی رات کو سرجو کی نیند ٹوٹ گئی۔ دیپک شرما اتنے زور کے خراٹے بھرتا تھا کہ اس کے قریب سویا کوئی بھی آدمی ایک بار جاگ جانے کے بعد دوبارہ نہیں سو سکتا تھا۔ بس وہ بھی نہیں سو سکی۔ باتھ رُوم سے باہر نکلی تو ماں کے کمرے سے چیخ کی آواز آئی۔

سرجُو ماں کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس کے سینے میں بہت زور کا درد اُٹھا تھا۔ اُسے ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دیر ماں کا سینہ سہلاتی رہی لیکن درد بہت ہی شدید تھا۔ وہ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی بلکہ اُس کا سر بھی دروازے سے ٹکرا گیا۔ اس نے دیپک کو بڑی مشکل سے جگایا اور اسے کہا کہ وہ کار باہر نکالے اور ماں کو اسپتال لے جائے۔ جب تک دیپک کمرے میں پہنچا ماں مرچکی تھی۔

بوڑھی، کمزور اور غیر صحت مند ماں ایک ساتھ دو صدمے برداشت نہیں کرسکی تھی۔ گڈّو کا گھر سے بھاگ جانا ہی اس کے لیے بڑا گہرا صدمہ تھا لیکن اپنے پوتے کے ہاتھوں یوں لُٹ جانا تو اور بھی قیامت تھی۔ قیامت آئی تھی اور گذر بھی گئی تھی۔ گھر کے درودیوار ڈھے گئے تھے۔ ایک بھی تو اینٹ نہیں بچی تھی۔ گھر کا آخری کمزور ستون بھی ٹوٹ گیا تھا۔

کالے رنگ کی فیونرل وین آئی۔ کچھ دیر رُکی۔ محلے کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں اس میں بیٹھیں اور کوئی تین گھنٹوں کے بعد انھیں واپس چھوڑ گئی۔ ماں نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا تھا۔ اس نے یہ نگری نیاگ دی تھی۔

کئی راتوں تک سرجُو کا بُرا حال رہا۔

اسے لگتا کہ دیپک کی ماں آدھی رات کے سمے اس کے سرہانے آکر کھڑی ہوجاتی تھی اور اس سے کہتی تھی کہ اس کی موت کی ذمہ دار سرجُو تھی۔ نہ وہ اس گھر میں آتی اور نہ گڈّو گھر سے اس طرح بھاگتا۔ اس نے بار بار دادی سے کہا تھا کہ وہ سرجُو سے نفرت کرتا تھا اور اگر اس کا کبھی بس چلا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ گڈّو نے گھر بھی سرجُو کی وجہ سے ہی چھوڑا تھا اور وہی ذمہ دار تھی اس کے زیوروں کے چرائے جانے کی بھی۔ وہ آدھی رات کے بعد اسے اپنی کمزور اور بے جان کلائیاں دکھا کر کہتی تھی کہ اُسی کی وجہ سے اُن میں اب سونے کی تو کیا کانچ کی چوڑی بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اسے ہر رات ہی کہتی تھی کہ انہی بے جان بازوؤں سے ایک دن وہ اس کا گلا گھونٹ کر اپنا انتقام لے لے گی۔ وہ پھر یہی الفاظ دوہراتے ہوئے وہ اندھیرے کی تہوں میں تحلیل ہوجاتی تھی۔ سُرجو بُری

طرح ڈری اور سہمی ہوئی رات بھر پلنگ کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ کر پڑی رہتی۔ ہر لمحہ اسے یہی خدشہ رہتا کہ ماں رات کے کسی پہر اُسے اپنے بے جان بازوؤں سے کھینچ کر موت کی راہوں پر بے دردی سے گھسیٹتی ہوئی لے جائے گی اور اس کا خاوند ساتھ کے پلنگ پر بے سُدھ پڑا زور زور سے خراٹے بھرتا رہے گا۔ صبح جب وہ اُٹھتی تو اسے لگتا کہ اس کا جسم مردہ ہو چکا تھا۔

اب تو یہ سچوایشن اور بھی نازک ہو گئی تھی۔

پہلے تو رات کو صرف دیپک کی ماں ہی اُسے پریشان کرتی تھی۔ اب ایک اور سایہ بھی اسے ہلکان کرنے لگا تھا۔ وہ اس کو پہچانتی نہیں تھی لیکن اُس سے اُسے ماں سے بھی زیادہ ڈر لگنے لگا تھا جب ماں اسے انتقام لینے کی دھمکی دے کر چلی جاتی تو ایک اور عورت اندھیروں کے پردوں سے نمودار ہو کر اُسے ایکدم جھنجوڑ دیتی۔ دھیرے دھیرے وہ جان گئی کہ وہ عورت شانتی تھی، گڈّو کی ماں جس نے اپنے خاوند سے تنگ آکر ایک دن خودکشی کر لی تھی۔ وہ اُسے کچی نیند سے جھنجوڑ کر جگاتی، اور کہتی کہ اس کی مُکتی اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی حفاظت کے لیے دن رات بھٹکتی رہتی تھی۔ جب تک اس کا بیٹا غیر محفوظ رہے گا وہ سرجُو کو اسی طرح ستاتی رہے گی۔ اس کے بیٹے کو گھر چھوڑنے پر مجبور بھی تو سرجُو نے ہی کیا تھا۔ وہ دانت پیس پیس کر کہتی کہ وہ ایک دن اسے طرح طرح کی اذیتیں دے کر اس کی جان لے گی۔ اور پھر گڈّو سے کہے گی کہ اُس کی لاش کو گدھوں سے نچوائے اور اُس کے جسم کی بوٹی بوٹی ان کے حوالے کر دے۔

ہر رات کا یہ کرب اب ناقابل برداشت ہو گیا تھا سرجُو کے لیے۔ وہ دن بھر ڈری ڈری سی رہتی تھی اور بات بھی کرتی تھی تو اسے یہ خوف رہتا کہ کہیں دونوں بھٹکتی ہوئی روحیں گھر کے کسی کونے میں کھڑی سُن تو نہیں رہی تھیں۔ دو ایک بار تو دیپک شرما نے بھی اس کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ ٹال گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ دیپک کی سینس آف گلٹ اتنی شدید ہو گئی تھی کہ وہ سرجُو کے جسم کو چھونے سے بھی ڈرنے لگا تھا اب۔ سرجُو اس کے ساتھ پلنگ پر پڑی ہوتی اور دیپک کی

ہمت نہ ہوتی کہ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے سیکس کی کوئی بات کرے، جیسے اس میں سیکس کی کوئی ارج ہی باقی نہیں رہی تھی۔ جیسے وہ پوری طرح سے امپوٹینٹ ہو چکا تھا۔ اسے جانے کیوں سرجو سے خوف آنے لگا تھا، جیسے سرجو اس کی بیوی نہیں تھی بلکہ کوئی غیر مرئی ہستی تھی جو اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ صرف ڈرنے کی چیز تھی پیار کرنے کی چیز نہیں۔ کچھ دیر جاگتے رہنے اور ایک عجیب طرح کی ذہنی کشمکش میں اُلجھے رہنے کے بعد، دیپک شرما اپنی بیوی سرجو کے ساتھ لگے پلنگ پر پڑے پڑے کچھ دیر اسنگت سی باتیں سوچتا رہتا اور پھر اس پر غنودگی چھا جاتی اور اس کے پُرشور خراٹوں سے کمرے کا ماحول تھرتھرانے لگتا۔ اور سرجو اپنے آپ کو بھٹکتی ہوئی روحوں سے بچانے کے لیے احساس کی اندھیری اور گہری گپھاؤں میں ڈوب جاتی کہ اب اسی میں اس کی سلامتی تھی۔

ایک عجیب طرح کا غبار چھایا رہتا تھا سرجو کے دل و دماغ پر رات دن۔ وہ غبار روز بہ روز گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ اپنے ماحول سے ایک دم کٹتی جا رہی تھی اور زندگی نے اسے بے رحمی سے گھسیٹ کر ایک ایسے جزیرے میں ڈال دیا تھا جس میں صرف دھند ہی دھند تھی، دھواں ہی دھواں تھا۔ کچھ بھی تو صاف نظر نہیں آتا تھا۔ نہ آکاش نہ دھرتی۔ نہ سورج نہ چاند۔ نہ پھول نہ پتے نہ پشو نہ پکشی۔ بھگوان یہ کون سی دنیا تھی جس میں اسے دھکیل دیا گیا تھا؟ کیا یہ دلنتے کا جہنم تھا؟ کیا یہ ملٹن کا پیرے ڈائیز لاسٹ تھا؟ آخر کیا تھا وہ عالم جس میں وہ سانس تو لے رہی تھی پر حقیقت میں مر چکی تھی؟

اس ذہنی تناؤ سے آخر ریزہ ریزہ ہو گئی سرجو۔ پس گئی ایک دم۔ ریت بن گئی بالکل۔ ریت بھی وہ جو سُوکھی ندی کے کناروں پر پڑی دھوپ میں جلتی رہتی ہے۔ کھشن کھشن کل کل کرتی ندی بہتی ہوئی ریت کے اسیم پھیلاؤ میں بدل گئی تھی۔ کیا یہی انت تھا سرجو کا؟ کچھ اسی طرح کی بات کہی تھی آنند نے بھی تو اسے ایک دن، جب وہ بہت ہی پریشان تھی۔ جب آنند نے اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھیں تھیں جب اس نے اس کے ستاروں

کی گردش کا بھی جائزہ لیا تھا۔

"ندی کے دو ہی انت ہو سکتے ہیں یا تو وہ اپنے کناروں میں بندھی مچلتی تھرکتی ساگر کی سمت بڑھ جائے اور ایک دن اس میں سما جائے اور یا..."

"اور یا کیا؟" سرجو نے ٹوک دیا تھا۔

آنند ایک دم زور سے ہنسا تھا اور بولا تھا۔

"اور یا پھر وہ سوکھ جائے گی۔ وہ منبع جہاں سے اسے پانی ملتا تھا اسے پانی مہیا کرنے سے انکار کر دے گا۔ ندی کا پانی دھیرے دھیرے سوکھنے لگے گا۔ اس کی تہ میں ناچتی، لہراتی، رنگ برنگی مچھلیاں اپنی جان بچانے کے لیے اپنے ٹھکانے بدلتی رہیں گی اور آخر ایک کٹھن ایسا آ جائے گا جب وہ کسی بھی ٹھکانے پر پہنچ کر زندہ نہ بچ سکیں گی۔ اور پھر ایک دن کناروں کی جلتی تپتی ریت ہوا کے گرم گرم تھپیڑوں کی مدد سے ان معصوم اور خوبصورت مچھلیوں کو پکڑ پکڑ کر کناروں پر پھینکنے لگے گی۔ سورج کی تیز کرنیں ان پر انگارے برسائیں گی اور جلتی تپتی ریت کے پھیلاؤ پر زندہ رہنے اور رقص کرنے کے خواب لیے وہ پیاری پیاری مچھلیاں مر جائیں گی اور ان سے بدبو نکلنے لگے گی اور ندی کے کنارے قبرستان میں بدل جائیں گے جہاں ہزاروں چھوٹی چھوٹی قبریں پھیل جائیں گی، جن میں پیاری پیاری مچھلیوں کے پیارے پیارے خواب دفن ہوں گے۔"

"آنند پلیز سٹاپ۔"

لیکن آنند نے اپنی بات روکی نہیں تھی۔ ندی کی بات ہو رہی تھی، رُک بھی کیسے سکتی تھی۔ ندی اور روک۔ بہت بڑا تضاد تھا۔ وہ کہتا چلا گیا۔

"جانتی ہو تم سرجو کہ جب ہم کسی سمادھی پر جاتے ہیں تو ہاتھ پاؤں دھو کر جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہر تیرتھ استھان کے پاس کوئی ندی، کوئی چشمہ، یا کوئی تالاب ضرور ہوتا ہے، جہاں یاتری ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں اور پھر سمادھی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی شردھا کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ان معصوم اور گمنام مچھلیوں کی ریت سے بنی ان گنت سمادھیوں پر کوئی نہیں جائے گا اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیونکہ اُسے ہاتھ پاؤں دھونے کے لیے ندی کا

پانی نہیں بلکہ اس میں کُھلی بدبُو، گندگی اور موت کا زہر ملے گا۔ زہر پی کر سمادھیوں پر جانے کی شرط کسی کو بھی منظور نہ ہو گی سرجُو۔ اور آخر ان گنت چھوٹی چھوٹی سمادھیوں کے ساتھ جو کناروں کی ریت پر قدم قدم پر پھیلی ہوں گی ایک دن ندی کے پانی کا آخری قطرہ بھی ختم ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا وہاں۔ نہ ندی کا وجود نہ معصوم خوابوں کی دُنیا۔

ایک دم پرلیہ کا عالم ہو گا۔

اس قیامت کے سمے اتنا گہرا دھُواں اور اتنی گہری دُھند چھا جائے گی چاروں طرف کہ کوئی کسی کو نہیں پہچان پائے گا۔ سارے رشتے ناطے ختم ہو جائیں گے۔ خود اپنی ذات بھی تمہارا ساتھ چھوڑ دے گی اور تم ٹوٹ جاؤ گی، ریزہ ریزہ ہو جاؤ گی۔ ریت بن جاؤ گی اور پھیل جاؤ گی چاروں طرف، سُورج کی تیز شعاعوں میں جلنے کے لیے۔"

"آنند سٹاپ" وہ چیخی تھی اور اس کی رُوح کے اندر خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی تھی اور وہ ایک دم لپٹ گئی تھی آنند کے ساتھ۔

"مجھے بچالو آنند میں مرنا نہیں چاہتی۔" وہ پھپک رہی تھی اور آنند اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"سرجُو تم اپنی تقدیر سے نہیں لڑ سکتیں۔ تمہاری تقدیر تمہارے اپنے ہی کرموں کا پھل ہے۔ بھگوان کرشن نے اپنے اُپدیش میں بھی ارجن سے یہی کہا تھا۔"

"سب جھوٹ بولا تھا اُس نے۔"

"صرف ایک ویکتی کے کہنے سے ایک بڑی سچائی جُھوٹ نہیں بن جاتی۔ تم ایک ویکتی ہو اور ندی کی طرح ویکتی کی بھی سیمائیں ہوتی ہیں سرجُو۔ ہم سب اپنی اپنی سیماؤں میں قید ہیں۔"

سرجُو کو لگ رہا تھا کہ وہ اُس سمے پاتال کی گہرائیوں میں پڑی تھی اور کوئی دیوتا ہمالہ پہاڑ کی آخری برف آلود چوٹی پر کھڑا اسے زندگی اور موت کی فلاسفی سمجھا رہا تھا۔ جانے کب تک وہ آنند کی آغوش میں اسی حالت میں پڑی رہی اور جانے کب تک آنند اُسے

اپدیش دیتا رہا، جس کا ایک شبد بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیونکہ اس سمے اس کے آس پاس بہت ہی گہری دھند چھائی ہوئی تھی، جو ہر گھٹن اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ خود آنند بھی نہیں جس کی آغوش میں پڑی وہ دھیرے دھیرے سسک رہی تھی!

ایک رات تو حد ہی ہوگئی۔

اس دن سرجو کو دوپہر کے وقت غشی کا دورہ پڑا تھا۔ دیپک شرما اس سمے گھر میں نہیں تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ کسی لڑکے کو پولیس والوں نے ٹرین سے پکڑا تھا۔ دیپک شرما کو شناخت کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ لڑکا گڈو نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن چلا گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی غیر حاضری میں سرجو کو بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا۔ نہ ہی سرجو نے اسے اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔ سرجو تو بس اپنے کمرے اور ڈرائینگ روم کے علاوہ کسی دوسرے کمرے میں جاتی ہی نہیں تھی۔ صفائی کرنے والی مائی جب بھی آتی تو وہ اسے صرف ہدایتیں ہی دیتی رہتی اس کے ساتھ کسی کمرے میں جاتی نہیں تھی۔ عجیب قسم کا ڈر بیٹھ گیا تھا اس کے دل میں۔ اسے لگتا کہ دیپک کی ماں اور اس کی پہلی بیوی شانتی دونوں سارا دن گھر میں گھومتی رہتی تھیں۔ دونوں میں سے ایک نہ ایک عورت ہر گھڑی اس کا پیچھا کرتی رہتی تھی۔ کئی دفعہ تو اسے لگتا کہ کسی نے اس کی ساری کا پلّو بھی پکڑا تھا کہیں سے۔ ایک صرف چیختی نہیں تھی وہ۔ ورنہ سرجو کی دماغی پریشانی کا تو کوئی انت نہیں تھا۔ کسی بھی کمرے کا دروازہ وہ اندر سے بولٹ نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے باتھ روم کو بھی اندر سے بند کرنا چھوڑ دیا تھا وہ باتھ روم کا دروازہ اندر سے بولٹ کیے بغیر ہی نہاتی۔ بلکہ جلدی ہی باہر نکل آتی۔ اندر ہوتی تو آئینے میں اسے آنند کی پرچھائیں نظر آتی۔ اب تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ سرجو کو اب آنند سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی بھوت بنگلے میں قید محسوس کرنے لگی تھی۔ باہر کی دنیا سے تو اس کا سمپرک ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے خاوند کے ساتھ باہر جانا اسے ویسے ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ خود وہ کبھی باہر گئی نہیں تھی۔ اسے اس

شہر کے بارے میں جہاں وہ بیاہ کر لائی گئی تھی کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اگر غلطی سے وہ شہر کے کسی حصے میں نکل جائے تو شاید آسانی سے گھر بھی نہ لوٹ سکے۔ سرجو تو جیسے ایک ایسی سیما پر کھڑی تھی جس کی دوسری طرف پاگل پن کا وسیع جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس ریکھا کے پار ایک بھی قدم اُٹھا تو وہ ایک ایسے گھنے جنگل میں پہنچ جائے گی جس میں نہ کوئی راستہ تھا نہ پگڈنڈی۔ بھٹکتی رہے گی چاروں سمت اور کہیں سے کوئی بھوکا جنگلی جانور اس پر جھپٹ کر اُسے زندہ کھا جائے گا۔ دماغی حالت کی اس سیما پر کھڑی سرجو جیسے ہر کشن ڈرتی رہتی تھی اور خوف سے کانپتی رہتی تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ اگر اس پر کسی نے حملہ کر دیا تو وہ چیخ بھی نہیں سکے گی۔ اس کے بولنے کی شکتی بھی چھن گئی تھی اس سے۔ مدافعت کا جذبہ ہی ختم ہو گیا تھا جیسے۔ کوئی دن دھاڑے اس کے گھر میں گھس کر اسے لُوٹ لے تو اس کا کچھ بھی ردعمل نہیں ہوگا۔ اب تو وہ باہر کا گیٹ بھی بند نہیں کرتی تھی۔ چوپٹ کھُلا رہتا تھا ہر گھڑی، دیپک یا تو گھر سے باہر جاتے ہوئے اسے بند کرتا تھا یا گھر واپس آنے پر۔ سرجو تو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی گیٹ کو کبھی۔ ایک آدھ بار تو دیپک نے ٹوکا بھی اسے۔

"تم، گھر کا گیٹ بھی نہیں بند کر سکتیں ؟"

"میں چوکیدار نہیں ہوں۔"

"تو میں چوکیدار ہوں ؟"

"آرمی کا کیپٹن چوکیدار سے اونچا ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا جا رہا ہے تمھیں ؟"

"ابھی تو شروعات ہیں، ہیوپے شینس۔"

"یہ گھر ہے کسی بے ہودہ سے اخبار کا دفتر نہیں ہے۔"

"اخبار کے آفس ایسے گھروں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔"

"بحث کیوں کرتی ہو؟ مت کیا کرو گیٹ بند۔ اب رہ بھی کیا گیا ہے لُٹنے کو۔"

سرجو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گیٹ سے ہٹ کر اندر آ گئی اور دیپک شرما

اپنی کار اور اپنے گھر کے گیٹ سے دیر تک الجھتا رہا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں باہر سے آتی رہیں۔

اس رات تو واقعی حد ہو گئی تھی۔

آدھی رات کے وقت سرجو کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ دیپک کی ماں تھی جو اس پر جھکی ہوئی تھی اور اپنے کمزور ہاتھوں کی انگلیاں اس کی گردن میں گاڑے جا رہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی لگا کہ کوئی اور آدمی اس کا دایاں بازو زور زور سے کھینچ کر اسے پلنگ سے نیچے گرا رہا تھا۔ اُس نے اپنی مُندتی ہوئی آنکھوں سے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا وہ شانتی تھی، گڈو کی ماں جو اسے فرش پر گرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی اور وہ ان دونوں عورتوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے سُنا شانتی کہہ رہی تھی۔

مجھے نیچے گرا لینے دو اس بُلھنی کو۔ تم پھر اس کا گلا گھونٹ دینا۔"

"پہلے مجھے اس کا گلا گھونٹ لینے دو۔ پھر تم اسے فرش پر گرا کر اس کی ہڈّی ہڈّی توڑ دینا۔"

"تم بہت ضدی ہو۔ اسی وجہ سے تو تمہارا گھر اُجڑا ہے۔ ضد نہ کرو مجھے اسے فرش پر گرا لینے دو۔"

"نہیں میں تو اس کا گلا گھونٹ کر ہی چھوڑوں گی۔"

"بُڑھیا، تم سے کچھ نہیں ہو گا۔ ناحق وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔"

"یہ کہہ کر بُڑھیا نے اپنی کمزور اُنگلیوں کے تیز تیز ناخن اس کے گلے میں گاڑ دیے۔ وہ درد سے چیخ اُٹھی۔ شانتی نے اس کے بازو پر گرفت اور بھی مضبوط کر دی تھی۔ ایک بہت ہی زوردار چیخ گونجی۔

دیپک شرما ہڑبڑا کر اُٹھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے روشنی جلاتے ہوئے کہا

سرجُو کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ اس کا سارا جسم پسینے سے تربتر ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی اور کانپے جا رہی تھی۔ دیپک شرما اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور جب اس نے اپنا ہاتھ سرجُو کے ماتھے پر رکھا تو وہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور بُری طرح تپ رہا تھا۔ پھر اس نے سرجُو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُسے لگا جیسے اس کا ہاتھ ایک دم بے جان ہو چکا تھا۔ وہ دیر تک سرجُو کے بے جان ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے اس کی پُشت سہلاتا رہا۔ پھر اس نے سرجُو کی پیٹھ پر بھی ہاتھ پھیرا۔ پسینے سے بھیگی پڑی تھی اس کی پیٹھ۔

"کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟"

"خواب نہیں تھا" اس نے کہا اور اپنی نظریں چھت پر گاڑے رکھیں۔

"تو کیا تھا پھر؟"

"وہ دونوں مجھے مار ڈالیں گی؟"

"کون؟"

"وہ" اس نے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اسے اب بھی وہ دونوں عورتیں دروازے پر کھڑی نظر آ رہی تھیں، جو بڑی خونخوار نظروں سے اُسے گھُور رہی تھیں اور بڑے ہی ڈرا دینے والے اشارے کر رہی تھیں۔

"کہاں؟" دیپک نے اس پر جُھکتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا اور اتنی دیر میں سرجُو بے ہوش ہو گئی۔

ایسی سچوایشن دیپک کو کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ سرجُو کو بہت دیر میں ہوش آیا۔

کیپٹن دیپک شرما کی ذہنی حالت بھی کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھی۔

شانتی کے خودکُشی کرنے کے بعد وہ بہت اُکھڑا اُکھڑا رہنے لگا تھا۔ گھر سے آخری تعلق کی کڑی رہ گئی تھی اس کی ماں۔ اس کے مر جانے کے بعد تو مانو گھر سے اس

کا رشتہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ گڈو گھر سے بھاگ گیا تھا اور اپنے ساتھ گھر کا اثاثہ بھی لے گیا تھا۔ دیپک شرما کو اب دِھیرے دِھیرے بڑی شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اُسے سرجو سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اگر شادی کر بھی لی تھی تو اُسے اس گھر میں ہرگز نہیں لانا چاہیے تھا۔ اس نے جیسے ایک آزاد، خوش رنگ اور خوش گلو پرندے کو پرواز کرتے کرتے پکڑ لیا تھا اور اس کے پنکھ کاٹ کر اُسے پنجرے میں قید کر دیا تھا۔ رات کے واقعہ کے بعد تو اسے واقعی یہ احساس ہو گیا تھا کہ جس خوشنما پرندے کو اس نے قفس میں ڈالا تھا اب تو اس کے پروں کے رنگ بھی مٹ میلے ہوتے جا رہے تھے، اس کی سُریلی آواز بھی گنگ ہو گئی تھی اور اس نے کھانا پینا بھی ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ اُسے لگا سرجو اس ماحول میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔

دوپہر کو جب سرجو کی حالت کچھ ٹھیک ہوئی تو دیپک نے اس کے پلنگ کے بہت ہی قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہو تو تمھیں چنڈی گڑھ چھوڑ آؤں؟"

"نہیں۔"

"تھوڑا چینج ہو جائے گا۔"

"اس سے بڑا چینج اور کیا ہو گا جو ہو چکا ہے۔"

"اپنے لوگوں کے درمیان کچھ دن رہنا اچھا لگے گا۔"

"میرا کوئی اپنا نہیں ہے چنڈی گڑھ میں اب۔"

"تمھارے پیرنٹس؟"

"دے آر ڈیڈ۔"

دیپک نے آنند کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا۔ اس سے سرجو اور بھی ناراض ہو جائے گی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ اُٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اور سرجو کے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ سرجو نے چائے لے لی۔ کہا کچھ نہیں۔ بات دیپک نے ہی شروع کی۔

"تم کہو تو اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں ۔"

"اس سے شاید میری زندگی کی معیاد بڑھ جائے" سرجو نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"چائے اچھی ہے؟" دیپک نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"اچھی ہے" جواب کے ساتھ سرجو کے چہرے پر جذبات کا کوئی رنگ نہیں اُبھرا تھا۔

"تم کچھ دنوں کے لئے چنڈی گڑھ چلی جاؤ تو میں اتنے عرصے میں کسی دوسرے شہر میں ملازمت تلاش کر لوں۔ میں نے کئی جگہ سیکیورٹی آفیسر کے لیے اپلائی کر رکھا ہے۔"

"چنڈی گڑھ جانے والے راستے کو میں یہاں آتے سے پہلے ڈائی نامائیٹ سے اُڑا آئی تھی۔ وہاں جانے کا اب کوئی راستہ موجود نہیں۔"

"میں تمھیں اکیلی چھوڑ کر کہیں جا بھی تو نہیں سکتا۔"

"مجھ سے پیار ہو گیا ہے یا مجھ پر ترس کھا رہے ہو؟"

"ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ می۔"

"ٹرائینگ آل ریڈی۔"

سرجو نے چند ہی گھونٹ لینے کے بعد چائے کی پیالی رکھ دی اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ وہ اور بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اب اپنی مجبوری اور بے بسی کا بُری طرح احساس ہونے لگا تھا۔

دیپک شرما کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اسے کسی انڈسٹریل یونٹ میں سیکیورٹی آفیسر کی ملازمت مل جائے۔ وہ شہر کو چھوڑ کر تو کہیں نہیں گیا تھا کیونکہ خط کتابت اور ٹیلی فون سے وہ بہت سی انڈسٹریل یونٹس سے اپنا سمپرک بنائے ہوئے تھا۔ ٹیلی فون اس کے اپنے گھر میں تو تھا نہیں۔ اس لیے وہ لوکل ٹیلی فون ایکسچینج کے چکر کاٹتا رہتا اور ٹیلی فون بُک کرواتا رہتا۔

کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد شام کی ڈاک سے اسے ایک اپوائنٹ مینٹ آرڈر ملا تھا۔ اُسے بھوپال کی ایک الیکٹرانک یونٹ نے سیکورٹی آفیسر کی پوسٹ کی آفر بھیجی تھی۔ اسے کہا گیا تھا کہ اگر اسے ملازمت کی شرائط منظور ہوں تو تار سے اطلاع کردے اور پندرہ روز کے اندر اپنی ڈیوٹی جوائن کرلے۔ وہ اس خط کو لے کر اندر آیا۔ سرجو آنکھیں بند کیے بستر میں لیٹی تھی۔

"جاگ رہی ہو؟"

"نہیں سو رہی ہوں۔"

"سوتے میں تو کوئی نہیں بولتا؟"

"مرے ہوئے لوگوں کی روحیں بولتی ہیں۔"

"آنکھیں تو کھولو۔ مجھے اپوائنٹ مینٹ لیٹر آگیا ہے۔ خود ہی پڑھ لو۔" اُس نے خط سرجو کی طرف بڑھایا۔ اس کا خیال تھا کہ سرجو یہ خبر سن کر ایک دم کھل اُٹھے گی۔ لیکن اس پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا اس خبر کا۔ بڑے بڑھیا کاغذ پر الیکٹرک ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا ہوا خط سرجو کی انگلیوں میں اٹکا رہا۔ اس نے خط پڑھا نہیں۔ آنند کو سرجو کے اس ردِ عمل سے صدمہ ہوا۔

"کس شہر میں جاب ملا ہے؟"

"بھوپال میں۔"

"قبرستان کی رکھوالی کروگے؟"

"میں سمجھا نہیں تمھاری بات۔"

"سمجھوگے بھی نہیں۔"

"کچھ کہو تو آخر۔"

"بھوپال ہی میں گیس ٹریجڈی ہوئی تھی تین برس پہلے۔ سینکڑوں لوگ مرے تھے۔ سینکڑوں ہی لوگ اب بھی دُکھ بھوگ رہے ہیں۔ دفنانے کے لیے قبریں بھی نہیں مل پائی تھیں، مرنے والوں کو۔"

"مگر اس سے کیا ہونا ہے؟"

"قبروں ہی کی تو حفاظت کروگے نا سیکورٹی افسر بن کر؟"

"یہ تو ایک الیکٹرانک کمپنی کی نوکری ہے سرجو!"

"مجھے قبروں پر چراغ جلانے کا شوق نہیں ہے۔ میں بھوپال نہیں جاؤں گی۔ تم اکیلے چلے جاؤ۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے!"

"یہ سوچنا تمھارا کام ہے۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکا ہوا خط دیپک کو واپس کر دیا اور اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔

دیپک شرما کچھ لمحے پلنگ کے قریب بیٹھا رہا اور پھر کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں پڑی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے سرجو کے اس بی ہیویر سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔

اس رات کیپٹن دیپک شرما بہت دیر تک شراب پیتا رہا اور پھر نشے میں چور سو گیا۔ اس رات سرجو کی نیند بہت ہی ڈسٹربڈ رہی۔ رات بھر اسے ڈراونے خواب آتے رہے۔

تین چار روز کے بعد بھوپال جانے کی بات پھر اٹھی۔

"تو تمھارا کیا فیصلہ ہے؟ آفر ریجیکٹ کر دوں؟"

"جیسا چاہو کر لو۔"

سرجو بستر پر پڑی تھی اور دیپک شرما سامنے بیٹھا دھیرے دھیرے وسکی پی رہا تھا۔

"تمھاری کیا رائے ہے؟"

"میرے دماغ میں اتنا کنفیوژن ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتی۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے تمھاری آنکھوں کے سامنے ہر وقت کوئی پرچھائیں گھومتی رہتی ہے۔"

"سب سے بڑی پرچھائیں تو میری اپنی ذات کی ہے۔"

"بہت جنگ رہتی ہے اپنے آپ سے؟"

"بہت ہی کڑی جنگ۔" سرجو نے ایک لمبی سانس لی اور دیپک نے اپنے گلاس سے ایک لمبا سِپ لیا۔ دونوں ہی عمل غیر ارادی تھے۔

"کیا ہوتا ہے جنگ کے بعد؟"

"جو ہُوا کرتا ہے۔ یہ اکیلے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ ہارنے والا تو ہارتا ہی ہے، جیتنے والے کی بھی ہار ہوتی ہے۔"

"تمھارے کیس میں کیا ہونا ہے؟"

"ہمیشہ ہارتی ہی ہوں۔ اب بھی تو ہار ہی رہی ہوں۔"

"کس سے؟"

"تم سے؟"

"مجھ سے! وہ کیسے؟" دیپک شرما نے حیرت سے کہا اور گلاس سے پہلے کی نسبت زیادہ بڑا سِپ لیا۔

"جو چکرویو تم نے میرے بھائی اور میرے ماں باپ سے مل کر بنایا تھا، میں اُس سے باہر نہیں آسکی۔ چکرویو سے باہر نکلنے کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"تمھارا بھائی تو کہتا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"پھر کبھی بتاؤں گا۔ اب رہنے دو۔"

"میں کبھی پوچھوں گی بھی نہیں۔ اس کے بارے میں۔ وہ بہت گھٹیا، ذلیل اور کمینہ آدمی ہے۔ میرے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہے اس لیے اُسے تمام جائداد کا اکیلا وارث بننے کا موہ ہے۔ اگر میں شادی نہ کرتی تو جائداد کا حصّہ مجھے بھی دینا پڑتا۔ یہ بات اسے کسی بھی حالت میں گوارا نہیں تھی۔"

"جائداد کی حصّہ دار تو تم شادی کے بعد بھی ہو۔"

"نہیں۔ اس کا موہ نہ مجھے پہلے تھا نہ اب ہے۔"

"یہ تم جانو۔" دیپک نے گلاس میں پڑی باقی وسکی ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالی اور پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سرجُو کا یہ جواب شاید اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔ سرجُو کو بھی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اتنی بحث کی ہی کب تھی اپنے ہسبینڈ سے؟ اس نے کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسے لگا کُھلے دروازے کی جِھری سے آنند کمرے کے اندر داخل ہو گیا تھا اور چپ چاپ اس کے پہلو میں لیٹ گیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ بائیں کہنی کے سہارے ہتھیلی پر ٹکا لیا تھا۔ جانے کیوں آج تو آنند کی ضرورت بھی تھی اُسے۔ آنند نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تمھیں حالات سے سمجھوتہ کرلینا چاہیے سرجُو۔"

"کوشش تو کر رہی ہوں۔ لیکن تم آکر میرا ارادہ کمزور کر دیتے ہو۔"

"تو نہیں آیا کروں؟"

"آیا کرو۔ مجھے کبھی کبھی تمھاری بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

"بہت مینٹل کونفلکٹ رہتی ہے تمھیں؟"

"ہاں۔"

"کوئی مضبوط فیصلہ نہ کر پانا ہی ہارنے کا موجب بن جاتا ہے۔"

"تو کیا کروں؟"

"اپنے فیصلے خود کرو اور مضبوطی سے کرو۔"

سرجُو کو لگا آنند کا اپنی کہنی پر ٹِکا چہرہ اس پر جھک گیا تھا اور پھر جانے کیسے سرجُو نے آنند کو کس کر اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ وہ اس کی گرم گرم سانسوں کی آنچ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ یوں لیٹے لیٹے ہی آنند نے اپنی بات پھر کہنا شروع کر دی تھی۔

"تمھارے دو بڑے دشمن ہیں سرجُو۔"

"ایک تو تم ہو اور دوسرا؟"
"نہیں، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"
"دوست بھی تو نہیں ہو۔"
"یہ تمہاری اپنی سوچ کی اُپج ہے۔ میرے خیال سے تمہارے دو ہی دشمن ہیں۔ ایک تمہاری اپنی ذات اور دوسرا تمہارا کریمنل قسم کا بھائی۔ تمہارا قاتل ان ہی دو میں سے ہوگا کوئی۔ یا تو تم اپنے ہی ہاتھوں قتل ہوگی یا تمہارا بھائی تمہیں قتل کرے گا۔"
"تمہارے ہاتھوں نہیں مروں گی میں؟"
"نہیں سرجو۔ میں تمہیں ایک ساتھ اتنی زندگیاں دے چکا ہوں کہ اگر میں تمہیں مار بھی دوں تو تم کسی نہ کسی روپ میں زندہ ہی رہو گی پھر بھی۔"
"اور اگر میرا بھائی مارے گا مجھے؟"
"تو تم کھشن بھر میں ہی مر جاؤ گی۔ اس لیے کہ اس نے کبھی تمہیں زندگی کا کوئی لمحہ نہیں دیا۔ ایک بھی سانس جمع نہیں کی تمہاری سانسوں میں اس نے صرف کم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ وہ جب ایک بار تم سے تمہاری زندگی چھینے گا تو پھر ایک سانس بھی واپس نہیں کرے گا سرجو۔ یہی تمہاری پہلی ٹریجڈی ہے اور دوسری ٹریجڈی...؟"
سرجو نے اور کس لیا تھا اُسے اپنے ساتھ اور اُس کی بات ادھوری رہ گئی تھی اور اُسے لگا کہ آنند کی گرم سانسوں کی نسبت اس کے ڈھیر سے رِستے ہوئے آنسو زیادہ ہو گئے تھے اور اس کے اپنے گال بھی آنند کے آنسوؤں کی نمی سے گیلے ہونے لگے تھے۔

"دوسری ٹریجڈی کیا ہے؟" سرجو نے بھرائی ہوئی آواز میں آنند سے پوچھا اور اسی لمحہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ کیپٹن دیپک شرما دوبارہ آگیا تھا۔ اور جانے کیسے آنند سرجو کے پہلو سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے بستر پر اس کے بدن کو ٹٹول رہی تھی اور اپنی گیلی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر تو دیپک شرما کھڑا تھا، سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے اس نے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

"یو آر مز ریبل وومن"

وہ بڑبڑائے جا رہا تھا اور اپنے گلاس میں وسکی انڈیلے جا رہا تھا۔

سرجو نے شاید اس کے الفاظ نہیں سنے تھے۔ اب وہ کچھ بھی تو سننا نہیں چاہتی تھی۔

سرجو نے ذہنی طور پر اب پوری طرح ہار مان لی تھی۔ بہت لڑ چکی تھی وہ اپنے آپ سے۔ بڑی مینٹل کونفلکٹ کا مقابلہ کر چکی تھی وہ۔ اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس مسلسل ذہنی کشمکش کا دن رات مقابلہ کرتی رہے۔ ایک حد ہوتی ہے خود سے لڑنے کی بھی آخر۔ اس حد پر پہنچ کر اس نے اب ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن یہ ہتھیار اس نے اپنی ذاتی اور ذہنی جنگ میں ڈالے تھے۔ اصلی جنگ جس میں وہ شریک تھی وہ بہت لمبی تھی۔ اس جنگ میں تو وہ آخری دم تک لڑتی رہے گی۔

سرجو اس شہر کو چھوڑنے اور اپنے خاوند دیپک شرما کے ساتھ بھوپال جانے رضامند ہو گئی تھی، بلکہ بھوپال آبھی گئی تھی وہ۔ جہاں اب سیکیورٹی آفیسر، کیپٹن دیپک شرما قبرستانوں میں آباد سیکڑوں قبروں کی رکھوالی کیا کرے گی، جن میں یونین کاربائیڈ کمپنی سے نکلی زہریلی گیس میں مرے سیکڑوں لوگ دفن تھے۔ جس سمے وہ بھوپال روانہ ہونے کے لیے سامان کی پیکنگ کر رہی تھی، اس سمے پیکنگ کے دوران اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔

سرجو جی! اب آپ ساگر تک نہیں پہنچ پائیں گی کبھی۔ اب آپ تیار ہو جائیے کسی صحرا میں جذب ہو کر اپنا وجود ختم کرنے کے لیے۔

لیکن اب جب اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اسے بدلے گی نہیں۔ اب وہ کسی بھی انجام کے لیے تیار تھی حالانکہ آنند اس کی سوچ پر اب بھی پوری طرح اثر انداز تھا۔

بھوپال پہنچ کر تو کئی دنوں تک وہ اپنے ماحول کا اور خود اپنے آپ کا جائزہ لیتی رہی۔ اُسے زندہ رہنے کے لیے کئی سمجھوتے کرتے پڑیں گے، یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ فیکٹری کے پاس ہی سٹاف کوارٹرز تھے۔ انہی میں سے ایک کوارٹر سیکیورٹی آفیسر کیپٹن دیپک شرما کو بھی ملا تھا۔ اُسے کوئی نہیں جانتا تھا یہاں۔ سب اُس

کے لیے اجنبی تھے۔ ان کوارٹروں میں رہنے والی عورتیں بھی تو اتنی ہی اجنبی تھیں سرجو کے لیے۔ لیکن آس پڑوس کی عورتوں نے سرجو سے ملنے کی شروعات کردی تھیں۔ نئے شہر اور نئے گھر میں سیٹل ہونے میں بھی وہ اس کی مدد کررہی تھیں۔ وہ موضوع جس پر اکثر گفتگو ہوتی تھی وہ یونین کاربائیڈ کمپنی کی زہریلی گیس کا حادثہ تھا جو تین سال گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھا۔ بھوپال کے لوگ اس حادثے کو اب تک نہیں بھولے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جو بھی خاندان اس حادثے کی زد میں آئے تھے ابھی تک جسمانی ذہنی اور اقتصادی مشکلات کا سامنا کررہے تھے۔ سرجو جب ایسی باتیں سنتی تو اس کے ذہن میں ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے دوران ہوئے واقعات کی یادیں تازہ ہوجاتیں۔ جن واقعات کا ذکر اس نے اپنے ماں باپ کی زبانی سنا تھا۔ بیالیس برس گزر جانے کے بعد بھی، وہ لوگ، جو ان واقعات سے گزرے تھے، ابھی تک ان کے ردِ عمل سے متاثر تھے۔ گیس ٹریجڈی سے متاثر ہوئے لوگ تو اب بھی اسپتالوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔ معاوضہ حاصل کرنے کے لیے دفتروں کے سامنے سجدے گزار رہے تھے۔ عورتیں اپنے بدحال بچوں کو کندھوں پر لادے دربدر ٹھوکریں کھاتی تھیں۔ نوجوان اپنے کمزور اعضا کو گھسیٹتے ہوئے روزگار کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ اور ادھر یونین کاربائیڈ والے اپنے تمام وسیلے استعمال کرکے سرکار سے کیس لڑ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کم سے کم معاوضہ ادا کرنا پڑے۔ قانونی داؤ پیچ میں اگر کسی کا فوری نقصان ہو رہا تھا تو وہ اس ورکر کا تھا جس نے زندگی بھر کاربائیڈ کمپنی والوں کی وفاداری سے نوکری کی تھی اور جو اب ایک دم محتاج اور بے بس ہوکر آسمان پر نگاہیں گاڑے اس صبح کا انتظار کررہا تھا جو اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے سلامتی اور تحفظ کا پیغام لے کر آئے گی۔ ایسی صبحیں کب آتی ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کے باوجود ہم سب ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں، کبھی کبھی تو زندگی بھر!

دھیرے دھیرے سرجو اپنے خول سے باہر نکلنے لگی۔ اسے جانے کیوں ہر لمحہ یہ احساس ہوتا تھا کہ تین برس کے بعد بھی آدھی رات کو چلنے والی ہوا میں ایم آئی سی کی

ہلکی ہلکی بُو گھلی ہوئی تھی، جو رات کی خاموشی میں آہستہ آہستہ زہر گھول رہی تھی۔
بھوپال شہر کی آدھی آبادی اب بھی ان جانے میں اپنی سانسوں کے ذریعے زہر پی رہی
تھی اور یہ زہر ان کی رگ رگ میں تحلیل ہو کر انھیں زندگی کی سیماؤں سے دُور کرتا جا رہا
تھا۔ اس لیے اسے یہ خواہش ہوئی کہ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے اپنی توفیق اور
صلاحیت کے مطابق کچھ کرے۔ شاید اس کی حقیر کوشش ان کے کسی کام آسکے۔ کچھ
دیر کے لیے سرجُو اپنی ذاتی پریشانیوں کو بھول سی گئی اور اُس نے اپنے آپ کو سوشل
سروس کے ایک گروپ سے پوری طرح وابستہ کر لیا۔ اس گرُوپ میں زیادہ تعداد اُن ہی
عورتوں کی تھی جو اُسی الیکٹرانک یُونٹ سے تھیں جن کے گھر والے یُونٹ کے سٹاف میں تھے۔
یہ گروپ سرجُو کو اس لیے بھی اچھا لگا تھا کہ اس گروپ کی عورتوں کو تصویریں اُتروانے اور
اخباروں میں چھپنے کا کمپلیکس نہیں تھا۔ وہ خود جرنلسٹ رہ چکی تھی اور اسے اس کا بخوبی
تجربہ تھا کہ افسروں کی عورتیں اپنے آپ کو اس لیے سماجی کاموں سے وابستہ کر لیتی
ہیں کہ اس سے اُنھیں پبلسٹی ملتی ہے۔ اور اسی لیے جس ادارے میں افسروں کی عورتوں کا
زیادہ دخل ہوتا تھا وہ اس سے دُور رہتی تھی۔ بھوپال میں اس کے لیے یہ ایک طرح کا
نیا تجربہ تھا۔ اسے پوری شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ سماجی بہبود کا کام کتنا
کٹھن اور جان لیوا تھا۔

"ویژن" میں کام کرتے ہوئے اس نے زیادہ تر چنڈی گڑھ کی جُھگی جھونپڑیوں
میں رہنے والوں کی تکلیفوں کا ہی جائزہ لیا تھا اور انہی کو لے کر وہ سرکاری محکموں اور سرکاری
لوگوں کے کام پر نکتہ چینی کرتی رہی تھی اور ان سے لڑتی رہی تھی اور ان کے خلاف ایڈیٹوریل
لکھتی رہی تھی۔ اصل میں تو بھوپال آکر اسے معلوم ہوا تھا کہ زہریلی گیس کے المیہ نے لوگوں
کو کیسے کیسے عذاب دیے تھے اور ان کے سامنے زندگی کے کتنے ہی مشکل اور
ناقابل حل مسائل پیش کر دیے تھے۔ اور ادھر یونین کاربائیڈ کمپنی والوں نے کس
خوبصورت بے اعتنائی سے انسانی زندگی کے اتنے بڑے المیے کو محض ایک معمولی اور
عام سے حادثے کا نام دے کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ کسی کو

بھی کسی قسم کا معاوضہ دینے کو تیار نہ تھے۔ عوام کی کچہری کی انھیں کوئی پروا نہ تھی۔ حالانکہ دُنیا میں عوام کی عدالت سے کوئی بھی بڑی عدالت نہیں ہے۔ وہ جب اُجڑی ہوئی، بیمار، کمزور اور محتاج عورتوں سے اور ان کے مریل اور جاں بلب بچوں سے مل کر گھر لوٹتی تو اُسے لگتا جیسے وہ واقعی کسی قبرستان سے لوٹ کر آئی تھی۔ گھر لوٹ کر اسے یہ احساس تو ضرور ہوتا کہ وہ حاجت مند لوگوں کی خدمت کر رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ایک دم بے بس اور شکست زدہ محسوس کرتی اور اس کا یہ خیال اور بھی مضبوط ہوتا جاتا کہ وہ ایک ایسی جنگ میں شریک تھی جو شاید کبھی نہیں جیتی جا سکتی۔ مخالف قوتیں بہت مضبوط، ہتھیار بند اور کیل کانٹے سے لیس تھیں۔ اُنھیں شکست دینا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں تھا

سرجو نے اپنے آپ کو پوری طرح سوشل سروس میں کھپا دیا تھا۔ زہریلی گیس سے متاثر لوگوں کو راحت دینے کے کام میں کئی سنستھائیں کام کر رہی تھیں۔ کچھ تو صرف طبّی امداد کے کھیشتر سے وابستہ تھیں۔ کچھ بچوں کی تعلیم اور انھیں روزی روٹی کمانے کے لیے ٹریننگ دینے سے جُڑی تھیں۔ عورتوں کو روزگار دلانے اور انھیں اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے ٹریننگ دینے کا کام کچھ ہی سنستھائیں کر رہی تھیں۔ ان میں سرجو کے ہسبینڈ کی فیکٹری کی سنستھا بھی شامل تھی۔ کچھ عرصہ اس سنستھا سے جُڑے رہنے کے بعد اس کی اس سنستھا میں دلچسپی کم ہو گئی تھی، اب وہ عورتوں کی ایک دوسری سنستھا سے وابستہ ہو گئی تھی، جس کا نام "سوا لمبھن" تھا۔

ایک بار جب وہ "سوالمبھن" میں گئی تو اس کی ملاقات گیس کی زد میں آئے ایک خاندان کی ایک خاتون سے ہوئی۔

"تمھارا نام؟"

"طلعت اختر۔"

"کس علاقے میں رہتی ہو؟"

"بھارت ٹاکیز کے نزدیک، نو بہار کے مندر کے پیچھے۔"

"جب دو دسمبر کی رات کو زہریلی گیس لیک ہوئی تھی تو کیا ہوا تھا؟"

"ہمیں اپنی آنکھوں میں بے پناہ جلن ہونے لگی تھی۔ پھر آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ سارا گھر دم گھونٹ دینے والے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ ہمیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔"

"پھر؟"

"کچھ دیر انتظار کے بعد ہم گھر سے باہر سڑک پر نکل آئے اور تیزی سے بھاگنے لگے۔ تھوڑی دیر دوڑنے کے بعد میں سڑک پر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں بی ایچ ای ایل اسپتال میں تھی۔"

"اور تمہارا خاوند؟"

"اس کا بھی یہی حال تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کا حال کیا بتاؤں، اس سے اگلی رات ہمارے گھر میں چوری ہوگئی۔ اور چیزوں کے علاوہ چور ہمارے گھر سے پینتالیس ہزار روپے کی رقم بھی لے گئے۔ یہ رقم ہم نے اِدھر اُدھر سے قرضے لے کر اکٹھی کی تھی۔ میرا خاوند اس رقم سے ایک چھوٹی سی فیکٹری لگانا چاہتا تھا۔ میرے خاوند کی حالت بہت خراب ہے۔ ہمارے تمام خواب اُجڑ گئے ہیں۔ اب تو خدا پر ہی بھروسا ہے۔"

"سوالبھن تمہاری کیا مدد کرسکتا ہے؟"

"میں کوئی کام سیکھنا چاہتی ہوں جس سے دو وقت کی روٹی چل سکے۔"

یہ گفتگو سرجو کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس قسم کی گفتگو وہ اس طرح کی کئی ضرورت مند عورتوں سے کر چکی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اسپتالوں میں چکر کاٹتی رہتیں اور جو وقت بچتا اس میں ایسے اداروں میں جاتیں جہاں انھیں زندگی گزارنے کے لیے اُمید کی کوئی پرچھائیں دکھائی دیتی۔

اُجڑے ہوئے بیمار اور محتاج لوگوں کے دلوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ جگانا اور انھیں پھر سے ایک نئی زندگی شروع کرنے کی پریرنا دینا بڑا مشکل کام تھا۔ ان

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی

لوگوں کو نہ سرکار پر بھروسا تھا نہ کسی سنستھا پر۔ ان کو تو اب اپنے آپ پر بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ ایک تاریک مستقبل ان کے سامنے تھا۔ اور انھیں مجبوراً ایک ایسے سفر میں شریک ہونا پڑا تھا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ جب کبھی پھر سے بسائے جانے اور معاوضہ دینے کا سوال اُٹھتا، خود غرض مخالف عناصر کچھ بھی نہ ہونے دیتے۔ لگتا تھا زہریلی گیس نے ان لوگوں کو بھی مفلوج کر دیا تھا، جن پر ویسے تو گیس کا اثر نہیں ہوا تھا، دو دسمبر کی رات کو، لیکن ان کی اپنی خود غرضیوں کے زہریلے دھوئیں نے ان کی سوچ کو مار ڈالا تھا۔ بظاہر تو یہ لوگ زندہ تھے لیکن حقیقت میں مر چکے تھے۔ ہر طرف مایوسی تھی۔

ہر سمت نااُمیدی تھی۔

کہیں بھی اُمید کی کوئی کرن نہ تھی، گھور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں۔

سرجو کو لگتا تھا کہ ویسا ہی اندھیرا جو بھوپال شہر کی فضا میں بھرتا جا رہا تھا۔ اب اس کے اپنے دل میں بھی جذب ہوتا جا رہا تھا اور گھٹن گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے یہ بات بُری طرح محسوس ہونے لگی تھی کہ اُس کی اپنی دنیا بھی دھیرے دھیرے اُجڑتی جا رہی تھی اور وہ اس تمام عمل کو بے بسی اور بے چارگی اور مجبوری کی حالت میں، خاموش دیکھے جا رہی تھی۔ نہ وہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔ زندہ رہنے کی اُس کی تمام صلاحیتیں ہی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی تھیں جیسے۔

کاش اسے کہیں سے کوئی سہارا مل سکتا!!

ذہن کی اُس کیفیت کے دوران سرجو کو آنند کی بہت یاد آتی۔ اس کی کہی ہوئی باتوں کے جملے اس کے دماغ میں گونجتے۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا۔ اُس کی آنکھیں اُس کی پیشانی۔ اس کے ہونٹ سرجو کو اپنے اتنے قریب لگنے لگتے کہ اس کے بدن میں کپکپی سے پھیل جاتی۔ کبھی کبھی تو وہ یہاں تک سوچنے لگتی کہ وہ آنکھیں بند کر کے ہونٹ بھینچ کر دیپک شرما کے سینے پر اپنا سر رکھ دے اور پھر یہ خیال کرتے ہوئے سو جائے اس کے سینے پر کہ وہ سینہ دیپک کا نہیں آنند کا تھا اور جو ہاتھ

اُس کی پیٹھ کو سہلا رہے تھے وہ کسی سابق فوجی افسر کے کھُردرے ہاتھ نہیں تھے بلکہ ایک ذہین اور حسّاس فنکار کے نازک نازک ہاتھ تھے جن کے ہر لمس سے اُس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی رمق رقص کرنے لگتی تھی۔

سرجو شاید غیر ارادی طور پر، اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی اُس لمحے کے لیے، جب وہ اپنی مرضی سے اپنے آپ کو دیپک شرما کے سپُرد کر دے گی۔ شاید ایسا ہی کوئی خیال اور کوئی جذبہ دیپک شرما کے دماغ کے کسی گوشے میں بھی دیئے کی مدھم لو کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ شاید دونوں ہی، بغیر ایک دوسرے کے جانے، اس ایک لمحے کی سمت دھیرے دھیرے بڑھتے جا رہے تھے جو بڑا کرڑا بھی ہو سکتا تھا اور بڑا نازک بھی۔ اس لمحے کی تپش سے لوہا فولاد بھی بن سکتا تھا اور شیشہ ایک دم پگھل بھی سکتا تھا۔ لوہا فولاد بن جائے تو اُس سے بڑے مضبوط جنگی ہتھیار بنائے جا سکتے ہیں اور اگر شیشہ پگھل کر کھولتا ہوا لاوا بن جائے تو وہ کسی فرد کو تو کیا سارے سماج کو جُھلس سکتا ہے۔

لیکن یہ لمحہ سرجو اور دیپک شرما کی زندگیوں میں آیا ہی نہیں۔ رُکا رہا بہت دیر وہ دہلیز پر۔ لیکن دروازہ نہیں کھُلا اور وہ کسی نراش جوگی کی طرح الکھ جگا کر لوٹ گیا۔ لمحے آتے ضرور ہیں۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے بھی رہتے ہیں لیکن دروازوں کو کھٹکھٹاتے نہیں۔ کواڑ نہ کھلیں اور گھر کی گرہنی سوئی رہے تو وہ خاموش قدموں سے واپس چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ بستی کے کسی بھی گھر کے کسی بھی دروازے کی طرف نہیں دیکھتے۔ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے جاتے ہیں۔ چپ چاپ، بِنا لب کھولے، بِنا پلک جھپکے۔ لمحوں کا یہی دستور چلا آ رہا ہے یگ یگانتر سے۔ اور شاید یہی دستور چلتا بھی رہے گا۔ جانے کب تک!

بس ٹھیک یہی ہوا اُس نازک سے لمحے کے ساتھ بھی، جو سب کی آنکھ بچا کر سرجو کے گھر کی دہلیز پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا، ملگجے سے اجالے میں، بھور کے سمے، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پر سوار ہو کر، یہ جھونکا اُسے گھر کی دہلیز پر دھیرے سے ڈال کر آگے نکل

گیا تھا۔ کچھ اور لمحوں کو کچھ اور گھروں کی دہلیزوں پر سلامتی سے پہنچانے کے لیے۔ جانے کس سمت سے ایک بہت بڑا طوفان اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پھیل گیا۔ بپھرتا ہوا پانی افق تک پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اپنے سامنے آئی ہر چھوٹی بڑی چیز کو بہائے لے جا رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ تیز و تند طوفان صرف گھر کے باہر ہی بپھر رہا تھا اور در و دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ گھر کے اندر جہاں سرجُو اور دیپک شرما موجود تھے پورا سکون تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا تک اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ تلاطم کی ساری شدّت باہر تھی۔ اندر اس کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ دہلیز پر پڑے نازک لمحے نے دہلیز کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اپنے کمزور ہاتھوں سے لیکن طوفان کا زور بڑھتے جا رہا تھا اور اس کے ہاتھ بُری طرح تھک گئے تھے۔ وہ دہلیز کو اب اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکے گا۔ اُسے انتظار تھا دروازہ کُھلنے کا اور اس تحفظ کا جو اسے گھر کے شانت واتاورن میں مل سکے گا اور وہ ایک بار پھر تر و تازہ ہو جائے گا اور اپنی سُوگندھ سے اندر کے واتاورن کو شرابور کر دے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہُوا، ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اچانک ہی پانی کا ایک زور دار ریلا آیا اور اس پھُول جیسے نازک لمحے کو ایک نوزائیدہ معصوم مرے ہوئے بچّے کی لاش کی طرح بہا کر ساتھ لے گیا۔ سرجُو اور دیپک شرما گھر کے محفوظ ماحول میں ایک دوسرے سے بے نیاز پڑے رہے اور بند دروازوں کے باہر طوفان ابھرتا رہا اور اس میں زہریلی گیس، جو بھاری تھی اور فضا میں اوپر نہیں اُٹھ سکتی تھی، گھُلتی رہی اور معصوم بچّوں کی طرح نازک نازک لمحے، گھروں کی دہلیزوں پر پڑے دم توڑتے گئے اور بپھرے ہوئے پانی میں ان کی لاشیں بہتی رہیں۔

گھر کے اندر شانتی تھی باہر پرلیہ تھی۔

اندر سکون تھا باہر قیامت تھی۔

رُوح میں روشنی تھی، دل میں اندھیرا تھا۔

اندر پت جھڑ کی خاموشی تھی، باہر طوفان کا شور تھا۔

اور اس پرلیہ، اس قیامت، اس اندھیرے اور طوفان کے اس شور کا کسی کو بھی

احساس نہ تھا۔

اس دن سرجُو کے نام ایک خط آیا تھا۔

چنڈی گڑھ چھوڑنے کے بعد تین برسوں میں یہ پہلا خط تھا جو اس کے نام آیا تھا۔ جانے کیوں کشن بھر کے لیے اُسے خیال آیا کہ شاید وہ آنند کا خط ہو، لیکن لفافے پر لکھے ایڈریس کی لکھاوٹ آنند کی تحریر سے مختلف تھی۔ آنند کے ہینڈ رائیٹنگ کو تو وہ اپنی تحریر سے بھی زیادہ پہنچانتی تھی۔ یہ اس کا خط نہیں تھا۔ اگلے لمحے اُسے یہ بھی خیال آیا کہ شاید یہ خط اس کی ماں کا ہو۔ لیکن یہ تحریر اس کی ماں کی بھی نہیں تھی۔ کہیں یہ خط اس کے بھائی گوز بخش کا ہی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے اس کا خاوند اس کے بھائی سے اب بھی خط کتابت کرتا ہو۔ لیکن یہ لکھاوٹ تو گوز بخش کی بھی نہیں تھی۔ جب تک وہ لفافہ چاک کرتی رہی اور اسے کئی جگہوں سے پھاڑتی رہی ڈھیر سارے خیال اس کے ذہن میں گھومتے رہے۔ اور جب اس نے خط کھولا تو وہ سکتے میں آگئی یہ تحریر تو کبھی اس کی نظر سے گزری ہی نہیں تھی۔ یہ خط گڈّو کا تھا، دیپک شرما کے بیٹے کا جو اپنی دادی کے تمام زیور چُرا کر گھر سے بھاگ گیا تھا، کوئی تین سال پہلے۔ بہت مختصر سا خط تھا۔

ڈیر مسز دیپک شرما۔

میں تمھاری ہی وجہ سے گھر سے بھاگا تھا۔ تمھاری ہی وجہ سے اپنی دادی کے تمام گہنے بھی چرائے تھے حالانکہ اس نے مجھے میری ماں سے بھی زیادہ پیار دیا تھا۔ تمھارے ہی کارن میرا ڈیڈی بھی بہت پریشان ہے اب۔ میں ایک بہت بڑے گینگ کا ممبر بن گیا ہوں۔ جس کا کام صرف قتل اور لُوٹ مار ہے۔ تم میرے ڈیڈی کو فوراً چھوڑ دو اور ہمارے گھر سے نکل جاؤ ورنہ تم قتل کر دی جاؤ گی۔

میں اب وہ گڈّو نہیں ہوں۔ بہت بدل چکا ہوں اس عرصے میں۔ اُمید ہے تم نے میری وارننگ کا ارتھ سمجھ لیا ہوگا۔

تمھارا ویل وشر

گڈّو دی گریٹ

خط پڑھتے ہوئے سرجو کی انگلیاں کانپنے لگی تھیں۔ خط پر نہ تاریخ درج تھی نہ شہر کا نام درج تھا۔ لفافہ چاک کرتے ہوئے سرجو سے ڈاک خانوں کی مہریں بھی کٹ گئی تھیں۔ اس لیے اسے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ گڈو نے یہ خط کہاں سے پوسٹ کیا تھا۔

اس اچانک ملنے والے خط کی سطریں ہی اس طوفان کی تیز و تند لہریں تھیں جنھوں نے دروازہ کھلنے کے انتظار میں، دہلیز پر پڑے نازک سے لمحے کو مردہ بچے کی لاش کی طرح، اپنی گرفت میں لے کر اُسے جانے کہاں پٹک دیا تھا۔

وہ لمحہ جس کا سرجو اور دیپک شرما غیر شعوری طور پر انتظار کر رہے تھے، ان کی زندگی کی حدوں پر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر، وقت کی اسیم وسعتوں میں تحلیل ہو گیا۔ وہ لمحہ جیسے کبھی وجود میں آیا ہی نہیں تھا۔ جیسے بیج کے جنم لینے سے پہلے ہی دھرتی نے اسے اپنی کوکھ سے باہر پھینک دیا تھا۔ جیسے قطرے کے موتی بننے سے پیشتر ہی سیپ نے اسے سمندر کی کسی تیز لہر کے حوالے کر دیا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے شیتل اور نرمل پانی کی پہلی دھار کو کسی بہت بڑی چٹان نے لڑھک کر اچانک ہی سُکھا ڈالا تھا۔

یہی ایک لمحہ تھا جو سرجو کی زندگی کو ایک نیا موڑ دے سکتا تھا۔

اسی لمحے کی اچانک موت ہو گئی تھی۔

وہ لمحہ جو اُس کی زندگی میں شاید کوئی انقلاب لا سکتا، مر گیا تھا۔ اب اُس کی زندگی میں کبھی کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ اب اُسے اِسی طرح جینا ہوگا۔ ایک بے مقصد اور بیکار سی زندگی گذارنا ہوگی اُسے۔ لیکن وہ اس طرح کی زندگی نہیں گذار سکے گی اب۔ اگر آنند اس کی زندگی میں آکر اسے زندگی کی وسعتوں سے آشنا نہ کراتا تو وہ ایسی زندگی بھی جی سکتی تھی۔ لیکن اب اس کے لئے اس فضول قسم کی زندگی کو گذارنا ناممکن تھا۔ وہ صرف اس لئے اس گھر میں جیتی رہے کہ ایک دن گڈّو آکر اسے قتل کر ڈالے کتنی فضول بات تھی یہ۔ وہ مر تو اب بھی رہی تھی، مگر دھیرے دھیرے تقسیم ہو ہو کر، کٹ کٹ کر۔ وہ مرے گی تو مکمل طور پر یوں ریزہ ریزہ ہو کر نہیں۔ وہ دن بھر گہری سوچ میں غرق رہی، اُس دن وہ سوشل ورک کیلیے بھی نہیں گئی۔ اب سب کچھ اُسے بے معنی اور ارتھ ہین لگ رہا تھا۔ آج دیپک شرما کی فیکٹری میں

کچھ بیسر پرو بلم کھڑی ہو گئی تھی۔ ورکرز کام پر نہیں گئے تھے۔ گیٹ کے باہر لال لال جھنڈے فضا میں لہراتے ہوئے نعرے لگا رہے تھے۔ سیکیورٹی والوں کے لیے بہت بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ کیپٹن دیپک شرما گھر بھی نہیں گیا تھا شام تک۔ اس نے یہ کہلوا بھیجا تھا کہ وہ رات بھی لیٹ ہی گھر آئے گا۔ سرجو نے اُس پیغام کو بڑے نارمل انداز میں سُن لیا تھا۔ اس پر اس اطلاع کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کا خاوند روز جب وقت سے گھر آجاتا تھا تب اسے کون سی خوشی ہوتی تھی۔ ایک نارمل سی بات تھی کام سے وقت پر گھر آجانا۔ اس کے خاوند کا وقت پر گھر نہ آنا بھی اس کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی اب تو اُسے کچھ بھی خاص نہ لگتا تھا، نہ کوئی آدمی، نہ کوئی گھٹنا، زندگی کا سارا ڈھانچہ ہی ایک عام اور سطحی نوعیت کا بن گیا تھا۔ کہاں تک ڈھوتی رہے گی وہ ایک بے ارتھ قسم کی زندگی! چلو پھینکو اس بوجھ کو اور اپنے کندھے ہلکے کرو۔ اور اس نے واقعی یہ بوجھ پھینک دیا اور اپنے کندھے ہلکے کر لیئے۔

دیپک شرما کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی سرجو ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا اٹیچی کیس لئے اور کندھے پر ایک نہایت ہی ہلکا سا شال ڈالے باہر والے گیٹ کو بند کر کے ریلوے اسٹیشن چلی گئی۔

کون سی ٹرین میں بیٹھی تھی وہ؛ کہاں کا ٹکٹ لیا تھا اس نے؟ اسے کچھ بھی دھیان نہیں تھا۔ اسے بس اتنا دھیان تھا کہ وہ گھر کے دروازے کو باہر سے بند کر کے آئی تھی اور گھر چھوڑتے وقت کچھ بھی ساتھ نہیں لائی تھی۔ نہ زیور نہ کرنسی۔ جتنی رقم اس کے پاس تھی اسی کو لے کر وہ گھر چھوڑ آئی تھی۔ کاش رستے میں اُسے کہیں گڈو مل جاتا تو وہ اس سے کہتی کہ اب وہ پوری شان سے اپنے گھر جا سکتا تھا۔ گھر کے سبھی دروازے کھلے تھے اس کے لیے۔ وہ تو اب جا رہی تھی اور کبھی واپس نہیں آئے گی۔

لیکن گڈو اسے راستے میں نہیں ملا۔

کوئی بھی تو نہیں ملا اُسے راستے میں، جسے کوئی بیورا دینا پڑے اُسے۔

جب ٹرین نے اسٹیشن چھوڑا تو وہ سیٹ کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئی اور

ایک دم خالی الذہن سی کمپارٹمنٹ میں بیٹھے مسافروں کو دیکھنے لگی اور پھر اس کی نظریں کمپارٹمنٹ کے شیشوں پر جم گئیں، جن میں سے وہ باہر لمحہ لمحہ گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے کو دیکھتی رہی ایک ٹک۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی رُوح کے اندر پھیلے ہوئے سناٹے اور بے جان اندھیرے میں دھیرے دھیرے ڈوبنے لگی۔ جیسے دُور سے پھینکا ہوا کوئی پتھر گہرے پانی میں آہستہ آہستہ اُترتا جاتا ہے۔ اور اسے یاد آگئی وہ شام جب آنند دبے پاؤں دروازے کی ایک چھوٹی سی جھری سے اندر داخل ہوگیا تھا اور چپ چاپ گھس آیا تھا اس کے بستر میں اور جب اس کی کسی بات کو سُن کر سرجو نے اسے اپنے ساتھ کس کر چمٹا لیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اس کا بھائی گوربخش اس کی زندگی کی پہلی ٹریجڈی تھا اور اُس کے یہ پوچھنے پر کہ دوسری ٹریجڈی کون سی تھی، آنند کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دیپک شرما کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا اور وہ اچانک ہی اس کے بستر سے نکل کر غائب ہوگیا تھا۔ آنند عین اُس گھڑی جب اُسے اُس کی بے حد ضرورت محسوس ہوتی تھی، غائب ہوجاتا تھا اور سرجو اکثر بے سہارا اور اکیلی رہ جاتی تھی۔ اس روز بھی اگر وہ اچانک چلا نہ جاتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ سرجو کی زندگی کی دوسری ٹریجڈی گڈو تھا، اس کا سوتیلا بیٹا۔

اپنی پیٹھ کو سیٹ کے ساتھ ٹیکے، بند آنکھوں کی مدد سے سرجو اپنی رُوح میں پھیلے گہرے سناٹے اور اتھاہ اندھیرے میں اور تیزی سے ڈوبنے لگی۔ ڈوبنے کے بعد تو کوئی کہیں بھی پہنچ سکتا ہے۔

اور جہاں سرجو پہنچی شاید وہی آخر تہ تھی۔
شاید وہ آخری کنارہ بھی تھا،
شاید وہ آخری تُند لہر بھی تھی۔
شاید وہ تیز جھکڑ کا آخری ریلہ بھی تھا۔
اُس ایک لمحے میں کیا کچھ پنہاں تھا، اس کا سرجو کو بالکل اندازہ نہ تھا۔

تریوینی

جب میوزیکل کال بیل کی ہلکی سی مترنم آواز کمرے میں گونجی، اُس سمے سادھنا ٹائپ شدہ صفحے سے آنند کے نئے ناول کی کچھ سطریں اُسے سنا رہی تھی۔

"اس ایج کی پیری ڈکامینٹ یہی ہے کہ تم سچ نہ بولو اور سچ بولنے اور سچ نہ بول سکنے کی کشمتا کے کرب کی دہلیز پر کھڑے تڑپتے رہو اور اپنے آپ سے سنگھرش کرتے رہو اور ٹوٹتے رہو اور بکھرتے رہو۔ وہ اپنے آپ کو مکمل کر لینے کی آرزو میں ہی ریزہ ریزہ ہوتا رہے۔ اِس صدی میں جینے والے انسان کا نروان شاید اسی میں ہے۔

آج کا دور کرائسٹ اور گوتم اور نانک کا دور نہیں۔ یہ ایک عام آدمی کا دور ہے جو کرائسٹ اور گوتم اور نانک بننے کے موہ میں عام انسان بھی نہیں بن پا رہا۔ اس یُگ کا آدمی ایک سادھارن انسان بھی نہیں بن پائے گا شاید۔ ایسا میرا وشواس ہے۔"

ٹائپ کیے کاغذوں کو صوفے پر ڈال کر سادھنا دروازہ کھولنے کو اُٹھی۔
دروازہ کھولا تو سامنے سرجو کھڑی تھی، ہاتھ میں نیلے رنگ کا چھوٹا سا اٹیچی کیس تھامے۔ سادھنا کو دیکھتے ہی سرجو سپٹا گئی۔

"تم ابھی تک یہیں ہو؟"

"ہاں۔"

"تین سال سے گھر نہیں گئیں؟"

"نہیں، اب تو چوتھا سال شروع ہو گیا ہے۔"

"آنند کہاں ہے؟"

"ڈرائینگ رُوم میں ہے۔ اندر آجاؤ۔"

اٹیچی کیس ہاتھ میں تھامے ہی وہ اندر آگئی۔ جب تک سادھنا نے دروازہ بند کیا، سرجُو ڈرائینگ رُوم میں آچکی تھی۔

"ارے تم!" آنند اُسے دیکھ کر اچنبھے میں آگیا۔

"حیرت ہوئی نہ دیکھ کر؟"

"ہاں۔"

"تم تین برسوں سے یہیں بیٹھے ہو، اسی صوفے پر، اِسی جگہ؟"

"ہاں۔ جہاں تم چھوڑ کر گئی تھیں، وہیں۔ کئی لوگ اپنی جگہیں نہیں بدل سکتے۔ یہی ان کی بدقسمتی ہے۔"

"میں بھی ساتھ ہی بیٹھی ہوئی ہوں جب سے۔ کال بیل کی آواز سن کر دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھی تھی صرف۔ یہ آلکسی آدمی تو دروازہ بھی نہیں کھول سکتا۔" سادھنا نے اس کے پیچھے کھڑے کہا۔

"شٹ اپ یُو مین گرل!" وہ زور سے چیخی۔ اٹیچی کیس ابھی اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔

"بیٹھ تو جاؤ اور اٹیچی کیس نیچے رکھ دو۔" آنند نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا اور سرجُو کے لیے جگہ خالی کر دی۔

"وہاں نہیں بیٹھوں گی اب۔ یہی بیٹھے گی۔" اُس نے سادھنا کی طرف طنز بھری نظروں سے اشارہ کیا۔

پھر اُس نے اٹیچی کیس کمرے کے عین درمیان قالین پر رکھ دیا اور دیوار

کے ساتھ رکھے صوفہ نما سٹول پر بیٹھ گئی۔ آنند دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔
سادھنا چھوٹی سی ٹرے میں، پانی کے دو گلاس لے کر آئی۔ جب ٹرے
اس نے سرجو کے سامنے کی تو وہ غصے سے بولی۔
"مجھے پیاس نہیں۔"
"دھوپ میں آئی ہو۔ پیاس تو لگ گئی ہوگی۔" آنند نے کہا
"نہیں۔" بڑا تلخ انداز تھا سرجو کا۔
"اچھا تو چائے بنا لاؤ سادھنا۔ ایک کپ میرے لیے بھی۔"
سادھنا کچن کی طرف جانے لگی تو سرجو نے ٹوک دیا۔
میرے لیے مت بنانا چائے۔"
"تو تم خود بنا لو۔ تین سال پہلے تم ہی تو پلایا کرتی تھیں چائے۔ تمھیں تو
میرے گھر کے بارے میں، مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔"
"بہت پانی بہہ چکا ہے، پُل کے نیچے سے اس عرصے میں۔" وہ بولی
"لیکن پُل تو وہیں ہے۔"
"وہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔"
سادھنا آنند کے پاس دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے سرجو کی طرف کوئی
توجہ نہ دیتے ہوئے صوفے پر رکھے ٹائپ شدہ کاغذ پھر اُٹھا لیے۔
"آگے پڑھوں؟"
"نہیں اب نہیں۔" آنند نے جواب دیا۔
"تم اپنی کہانی جاری رکھو۔" سرجو نے بڑی تلخی سے کہا
"کہانی نہیں، ناول ہے۔ آنند نے نیا ناول لکھا ہے۔ اسے ٹائپ بھی میں نے
ہی کیا ہے۔"
"کچھ تو شرم کرو، بے حیا۔" وہ چیخی
"تم سے شرم کروں؟ جو اِس شخص کو اتنی مدت تک پیار کرنے کا ڈھونگ

رچتی رہی اور ایک دن اُسے صرف اس لیے چھوڑ گئی کہ اُس کے ساتھ صوفے پر ایک اجنبی لڑکی بیٹھی تھی اُس دن۔ وہ لڑکی آج بھی وہیں بیٹھی ہے، اُسی جگہ مسز سرجُو شرما۔ اور وہ ڈھونگ نہیں رچ رہی۔ وہ اُس آدمی کو پیار کرنے کا سرِعام دعوا کرتی ہے۔ اور تم ——!"

"سادھنا خاموش ہو جاؤ۔ سرجُو مری مہمان ہے۔" آنند نے اپنا ہاتھ سادھنا کے مُنہ پر رکھ دیا۔

"اور جو کبھی مالکن ہوتے کا ڈھونگ رچتی رہی۔" وہ زور سے ہنسی۔

"سادھنا!" آنند کا ہاتھ اُٹھا، اس کے گال کی طرف لیکن پھر صوفے پر ٹِک گیا آپ سے آپ۔

سادھنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بلکہ دو ایک آنسو ٹائپ شدہ کاغذ پر گر کر پھیل بھی گئے الفاظ پر۔

"کہو، کہاں سے آ رہی ہو؟" آنند نے سرجُو سے پوچھا

"بھوپال سے۔"

"اکیلی ہی؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"تمھارے ساتھ رہنے کو۔"

آنند خاموشی سے اسے دیکھتا رہا کچھ لمحے۔ سادھنا صوفے سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

"آخر ہُوا کیا؟"

"میں اُس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"کس کے ساتھ؟"

"اپنے ہسبینڈ کے ساتھ۔"

"اُس نے چھوڑ دیا ہے تمھیں؟"

"نہیں میں ہی چھوڑ کر آئی ہوں اُسے۔"
"کس کے بھروسے پر؟"
"تمھارے بھروسے پر۔"
"لیکن میرا وشواس تو تم خود ہی توڑ کر گئی تھیں۔"
"وہ میری غلطی تھی۔"
"اب دوسری غلطی کرنا چاہتی ہو؟"
"نہیں، پہلی غلطی سُدھارنا چاہتی ہوں۔"
"لیکن پُل کے نیچے سے تو بہت پانی بہ چکا ہے اس دوران۔" وہ ہنسا
"پُل تو باقی ہے۔"
"اُسے تو تم ڈائنامائیٹ سے اُڑا کر گئی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا اس کا اب۔"
"میں دوبارہ بنالوں گی۔"
"ٹوٹے ہوئے پُل دوبارہ کہاں بنتے ہیں؟"
"تو میں نیا پُل بنالوں گی۔"
"نیا پُل تو بن ہی رہا ہے مسز سرجُو شرما۔"
سادھنا نے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے کہا۔
"اُسے مکمل ہو جانے دو پھر ڈائنامائیٹ سے اُڑانا آسان رہے گا۔"
"تم سمجھتی ہو کہ تم آنند کو مجھ سے چھین لوگی؟"
"میں بالکل ایسا نہیں سمجھتی۔ بلکہ اب تم چھیننا چاہتی ہو اُسے۔"
"چُپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمھاری زبان کاٹ دوں گی۔"
"زبان کاٹ دینے سے سچ تو نہیں مر جاتا۔ سچ تو سچ ہی رہتا ہے سرجُو۔"
"تو سچ کیا ہے؟"
"سچ وہی ہے جو آنند نے اپنے ناول میں لکھا ہے جو میں اسے پڑھ کر سُنا رہی تھی کچھ دیر پہلے۔ کہو تو وہ لائنز تمھیں بھی سُنا دوں، جو میں تمھارے آنے سے

پہلے پڑھ رہی تھی۔"

سرجُو خاموش رہی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

سادھنا آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی اور ٹائپ شدہ کاغذ اپنے سامنے رکھ لیے۔ صفحے پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کی نمی نے دو تین لفظوں کو ایک دم خراب کر دیا تھا۔

اُس نے صفحے کو دِھیرے دِھیرے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اور جب سادھنا ان سطروں پر پہنچی تو سرجُو کی آنکھوں میں سرجُو ندی اُمڈ آئی تھی۔

"— آج کا آدمی ایک سادھارن انسان بھی نہیں بن پائے گا شاید۔ ایسا میرا وِشواس ہے —"

"تمھارا وِشواس ٹھیک ہی ہے آنند۔" سرجُو نے اُمڈتی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بڑی ہی پژمُردہ آواز میں۔

پھر وہ سٹُول سے اُٹھی اور ڈرائینگ رُوم میں گئی اور فرِج کھول کر بوتل کو ہی مُنہ سے لگا کر ٹھنڈی بیر پینے لگی۔ غٹاغٹ پی گئی آدھی بوتل وہ۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ ڈرائینگ رُوم میں واپس آگئی۔ اس نے نیلے رنگ کا اپنا اٹیچی کیس اُٹھایا اور ڈرائینگ رُوم سے باہر نکلنے لگی۔ آنند اور سادھنا جو اب تک چُپ چاپ اس کا جائزہ لیتے رہے تھے ایک دم صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" آنند نے پوچھا

"تم دونوں وہیں بیٹھے رہو، اسی صوفے پر، جہاں میں نے تمھیں تین سال پہلے بیٹھا دیکھا تھا اور بوکھلا کر اپنی تقدیر اپنے بھائی کے قدموں پر پھینک دی تھی۔ جس نے ایک دن مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اُس کہانیاں لکھنے والے کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو —!

نہیں تو کیا کرو گے تم؟

اُسے مار ڈالوں گا۔

اور اُس نے تمھاری کہانیوں کی نئی کتاب، جس پر میرا نام لِکھ کر، تم نے بڑے

پیار سے مجھے دی تھی، میری آنکھوں کے سامنے ورق ورق کر دی تھی۔"

"تم نے میری جان بچائی تھی۔ ورنہ تمہارا بھائی مجھے مار ڈالتا۔"

سادھنا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن آنند نے اس کا ہاتھ دبوچ کر اسے بولنے سے روک دیا تھا۔

"اُس وقت میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" سرجو نے جواب دیا۔

"اور اب؟"

"اب مجھے ایسا کوئی وہم نہیں ہے۔"

"اُس واقعہ کے بعد تو تم نے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا تھا اور مجھے بھی کئی دنوں تک نہیں ملی تھیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ لیکن زیادہ دیر اپنے پیرنٹس کا گھر نہیں چھوڑ سکی تھی۔ واپس آگئی تھی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں کمزور تھی۔ اور اس لیے بھی کہ تم نے میرا وشواس توڑ دیا تھا۔"

اب سادھنا خاموش نہ رہ سکی۔ اُس کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔ اب آنند نے بھی اس کا ہاتھ نہیں دبوچا۔ اب وہ لمحہ آگیا تھا جب سادھنا کو اپنی بات کھل کر کہہ دینا چاہیے تھی۔ اس نے بڑی ہی جذباتی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"آنند نے نہیں، تم نے خود ہی توڑا تھا اپنا وشواس۔ تمہارے وشواس کی بنیاد ہی کمزور تھی۔ بہت کھوکھلی تھی وہ بنیاد۔ تمہاری سوچ کا دائرہ صرف یہیں تک محدود تھا کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بہت نزدیکی سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو وہ اُسی کا ہو جاتا ہے اور اس عورت کو جو اسے پیار کرنے کا دعوا کرتی ہے، چھوڑ دیتا ہے۔ تمہارا قصور نہیں ہے سرجو۔ قصوروار تمہارے سوچنے کا انداز ہے۔"

آنند میرا ہاتھ اپنے نرم، ملائم ہاتھوں میں لے کر، میری ہتھیلیوں میں پھیلی لکیروں

کے جال کو دیکھ رہا تھا۔ میری تقدیر پڑھ رہا تھا وہ۔ اُسے دوسروں کی تقدیریں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن اُسے یہ اب تک معلوم نہیں کہ اس کی اپنی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی تقدیر جان سکتی، عین اسی لمحہ تم نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی ساری چھُریاں آنند کے وشواس کے سینے میں بڑی بے دردی سے گھونپ دیں اور لمحہ بھر میں اُسے اتنے گہرے زخم دے دیے، جو اب تک بھی نہیں بھر سکے۔ تم نہیں جانتیں میں کب تک آنند کے سینے سے رِستے ہوئے گرم گرم لہو کو اپنے ہونٹوں سے پیتی رہی ہوں۔ تم یہ بات کبھی جان بھی نہیں پاؤ گی سرجو! آنند کا لہو تو میری رگوں میں بھی گھُل گیا ہے اب —"

سادھنا کا گلا بھرّا گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی آگے۔

"سادھنا!!" آنند چیخا اور اس نے سادھنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سادھنا اس کے گلے سے لگ کر پھپھکنے لگی۔

سرجو اپنی آنکھوں سے رِستے ہوئے آنسوؤں کو اپنے پلّو میں جذب کرتے ہوئے چُپ چاپ ڈرائینگ رُوم سے نکل کر، پل بھر میں گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ جانے کیوں وہ ذرا دیر کو گیٹ پر رُک گئی۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگے اپنے پلّو سے آنند کی نیم پلیٹ کو پونچھا۔ پلّو پر لگی گرد کو اپنے ماتھے سے لگایا اور مرے ہوئے سے قدم اٹھاتی، خاموش، ویران لین پر آگے بڑھ گئی۔

سرجو کے سامنے اس سمے کوئی منزل نہیں تھی!

کچھ دیر بعد آنند اور سادھنا صوفے سے اُٹھے اور ڈرائینگ رُوم سے باہر آکر چُپ چاپ کھُلے گیٹ کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ گیٹ کے عین سامنے خاموش اور ویران سی لین تھی، جسے پار کر کے سرجو مین سڑک کے موڑ پر پہنچ کر اب تک نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ آنند ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ لگتا تھا ایک سمندر بپھر رہا تھا اُس کے اندر۔ گیٹ کی ایک طرف دیوار پر ایک فائل رکھی تھی۔ آنند نے وہ فائل اُٹھالی۔ فائل کے اوپر موٹے موٹے اکھشروں میں لکھا تھا۔ دی ٹریجڈی آف

بھوپال — سرجو جی کا ہینڈ رائٹنگ تھا۔ آنند نے فائل کھولی اس میں بیسیوں اخباروں اور رسالوں کی کلپنگز رکھی تھیں بھوپال کی گیس ٹریجڈی کے بارے میں۔ بڑی ترتیب سے تاریخ وار لگا رکھی تھیں سرجو نے وہ کلپنگز۔ آخری کلپنگ اسی دن کی تھی۔ اخبار شاید اس نے راستے میں خریدا تھا۔ کورٹ نے گیس سے متاثر لوگوں کی معاوضے کی درخواست کو نامنظور کر دیا تھا۔ سرجو کا اپنا مقدمہ بھی شاید خارج ہو گیا تھا اب۔ اس کی گواہیاں کمزور تھیں شاید اسی لیے۔ آنند آخری پریس کلپنگ پر نظریں گاڑے اندر آ گیا۔ اس کے اندر بپھرتا ہوا سمندر اب کناروں تک پہنچنے ہی والا تھا۔ اس کی آنکھیں چھلکنے ہی والی تھیں۔

سادھنا کھلے گیٹ کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور اس کی نظریں سامنے والی خاموش اور ویران لین پر جمی تھیں، جو تھوڑی دوری کے بعد مین سڑک میں مدغم ہو جاتی تھی۔

اس شام آنند کے لینڈ لارڈ مسٹر ورما کو بڑا شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس گھڑی ان کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

اسی شام پولیس نے گوربخش کو یونیورسٹی کے پاس والے سلم ایریا سے ڈرگ ٹریفکنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔